

UNIVERSAL  
LIBRARY

**OU\_224526**

UNIVERSAL  
LIBRARY









# اُردو

## انجمن ترقی اُردو کا سہ ماہی رسالہ

ایڈیٹر

عبدالحق بی۔ اے (علیگ)

آنریری سلیٹی

انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد (دکن)

# اردو

۱ - یہ انجمن ترقی اردو کا سہ ماہی رسالہ جنوری، اپریل، جولائی اور اکتوبر میں شایع ہوا کرتا ہے۔۔

۲ - یہ خالص ادبی رسالہ ہے جس میں زبان اور ادب کے مختلف شعبوں اور پہلوؤں پر بحث ہوتی ہے۔ حجم کم از کم ڈیڑھ سو صفحے ہوتا ہے۔

۳ - قیمت سالانہ محصول ڈاک وغیرہ ملا کر سات روپے سکہ انگریزی (مع محصول ڈاک وغیرہ آٹھ روپے سکہ عثمانیہ)۔

۴ - تمام خط و کتابت مولوی عبدالعق صاحب بی اے، آنریری سکریٹری انجمن ترقی اردو اورنگ آباد (دکن) سے ہونی چاہیے۔



( باعتماد محمد صدیق حسن مدیر انجمن اردو پریس، اردو باغ اورنگ آباد دکن میں چھپا اور دفتر انجمن ترقی اردو سے شایع ہوا )



# اردو

حصہ ۵۹

جولائی سنہ ۱۹۳۵ ع

جلد ۱۵

انجمن ترقی اردو کا رسالہ

دکن بک اینڈ اسٹیشنری مارٹ  
۱۰، لاکھنؤ ٹریڈنگ کمپلیکس، ترقی اردو سوسائٹی، کولہا پور

اورنگ آباد (دکن)



# اُردو

## فہرستِ مضامین

بابتِ جولائی سنہ ۱۹۳۵ ع

نمبر	مضمون	مضمون نگار	صفحہ
۱	ادب اور زندگی	اختر حسین صاحب راے پوری	۴۳۹
۲	ٹیگور کے ادبی مضامین	پلڈت ونشی دھر صاحب ودیا النکار	۵۱۹
۳	سخنورانِ ایران در عصر حاضر	جناب آغا محمد تقی "پارسا" شیرازی	۵۲۸
۴	سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ	آڈیٹر	۵۲۳
۵	شمالی ہند میں اردو شاعری کی ابتدا و ترقی	جناب شیخ چاند صاحب ایم - اے	۵۵۹
۶	کبجرات کا باکمال شاعر اردو شیرخبردار	اختر حسین صاحب راے پوری	۵۶۹
۷	بادۂ کہن (غزلیات اشرف)	(چ)	۵۸۳
۸	تبصرے	آڈیٹر ودیگر حضرات	۵۹۱



# ادب اور زندگی

از

( از جناب اختر حسین صاحب راء پوری یو - اے )

ماضی کو سمجھتے، مستقبل کا پیغام دنیا کو سنا — میرے ضمیر سے  
ادب کا یہ تقاضا تھا - ماضی اور استقبال کو میں سمجھا لیکن  
' آج کی ' دنیا میں میرے لئے جگہ نہیں - اب ادب کا یہ تقاضا  
ہے کہ میں اپنی زندگی ختم کر دوں " —

( روسی ادب جدید کے علم بردار ' میکروسکی ' کا آخری خط )

ادب کیا ہے ؟ ادب برائے ادب یا ادب برائے زندگی ؟ ادب کے  
صد کیا ہیں ؟ — یہ سوالات اتنے ہی پرانے ہیں جتنی علم ادب کی  
گی - ارباب حل و عقد نے اس مباحث پر بڑے بڑے دفتر سیاہ کر دئے  
اور اب اس موضوع پر از سرنو کچھ کہنا تحصیل حاصل سمجھا جائے گا -  
اگر مجھے اس کا احساس نہ ہوتا کہ آج زندگی ایک نئے سانچے میں ڈھل  
رہی ہے سماج ایک دور تغیر سے گزر رہا ہے اور انسانیت ارتقاء بالقد  
( Dialectics ) کے دورا ہے پر آکر ہر ایمان دار ادیب سے پرچہ رہی ہے کہ —

" دونوں میں سے کس کے موئید ہو — پیشہ ور گوشہ نشینی

یا عوام سے یگانگی ؟ جنگلوں اور پہاڑوں کی چاہت یا انسان

کی خدمت ؟ غیر ذمہ دارانہ خودسری یا خیالات کا ارتباط

قدرت یا ضمیر؟ جبر یا اختیار؟ تقدیر یا تدبیر؟ قدرت کی اطاعت یا قدرت پر حکومت؟ آرت آرت کے لئے یا آرت انسان کے لئے؟ زمین یا آسمان؟ دوئی یا یگانگی؟ — ان میں سے ایک پر زندگی درگور دنیائے قدیم کا انحصار ہے اور دوسرے پر مستقبل کا دار و مدار — تم دونوں میں سے کس کے حامی ہو؟“

( زمانہ حال کا ادب از پی۔ سی۔ کوگن )

اگر یہ مرحلہ در پیش نہ ہوتا اور ادیب سماج کا ایک فرد نہیں بلکہ کوئی بن باسی ہوتا تو مضمون کی نوعیت مجھے قلم اُٹھانے کی اجازت نہ دیتی۔ مگر چونکہ معاملہ اس کے برعکس ہے اور حقائق زندگی و اشارات ادب کی خامیچ اس ملک میں وسیع تر ہوتی جاتی ہے اچھا ہو کہ یہ مسئلہ پھر چھپوا جائے اور یارین نکتہ دان کے آگے یہ اہم سوال پیش کیا جائے — مضمون کے پہلے حصے میں دکھایا جائے گا کہ تخلیق ادب معاشی زندگی کا ایک شعبہ ہے اور ادب زندگی کا پروردہ اور آئینہ دار ہے۔ پھر جب یہ تصنیف ہو چکے گا کہ زندگی اور ادب کے مقاصد ایک ہیں تو روح متصد کی وضاحت کے لئے ہم ہندوستانی ادب کا ایک ہلکا سا خاکہ پیش کریں گے اور دیکھوں گے کہ ہمارے ادب نے اپنے فرائض کی تکمیل کس حد تک کی ہے۔ مہرا خیال ہے کہ ہندوستان پر برطانیہ کی فتح سامنتی ( Feudal ) تمدن پر حرفتی ( Industrial ) تمدن کی فتح تھی اور ایسی سماج کی سامنتی بنیاد جو پلاسی کی جنگ سے پہلے متزلزل ہو رہی تھی ہلکامہ سنہ ۵۷ ع کے صدمے سے اس کا شیرازہ تیزی سے منتشر ہونے لگا۔ ہلکامہ سنہ ۵۷ ع ہمارے سماج کی منزل ارتقا میں ایک حد فاصل قائم کرتا ہے۔ اس زاویہ نگاہ کو روشنی میں ادب ہند کے بھی دو دور متدرج کئے جاسکتے ہیں۔ ایک وہ

جو اس زمانہ کے لگ بھگ انحطاط پذیر ہونے لگتا اور دوسرا وہ جو اس کے بعد رفتہ رفتہ آنکھیں کھولنے لگتا ہے - آسانی کے لئے ہم انہیں قدیم اور جدید ادب کہہ سکتے - یہ تجزیہ خالصاً معاشی ہے - برسبیل تذکرہ مجھے یہ کہنے میں تکلف نہیں کہ غزل کوئی کا زوال سامنتی تہذیب کی تباہی کا پرتو اور نظم کی اتھان سماج کے بند پانی کی روانی کی علامت ہے جو ہدوز رسوم و اوهام کی کشمکش میں مبتلا ہے -

کسی یونانی حکیم کا قول ہے کہ خیالات کی ایلٹوں کو جذبات کے چونے سے ہی جوڑا جاسکتا ہے - انسان خیالات و جذبات کا مجموعہ ہے - سائنس خیالات میں ربط و نظم قائم کرتا اور ان کی تراش خراش کرتا ہے - آرت جذبات کو بذاتاً، سڈارتا اور نقش و نگار اشارات و الفاظ کے ذریعے ان کی ترجمانی کرتا ہے - ادیب اپنی جذباتی کیفیات کو الفاظ کا جامہ پہناتا اور اپنی افتاد طبیعت کے مطابق اس کی کات چھانت کرتا ہے - مدعا یہ ہے کہ ادب جذبات کی بولتی ہوئی تصویر ہے - دیکھنا یہ ہے کہ جذبات کی ترتیب و تکوین کس طرح ہوتی ہے - ظاہر ہے کہ ہر جذبہ گرد و پیش کا مطیع ہے اور حالات کے مطابق جذبات بدلتے رہتے ہیں - فضا کا ہر پھیر کبھی آدمی کو دلانا اور کبھی ہنساتا، کبھی آزرده اور کبھی غضبناک بنا دیتا ہے - مثلاً 'موت' اور 'بھوک' کے مسائل ہمیشہ آدمی کو خون کے آنسو دلاتے رہے ہیں - ایک کے لئے قدرت دوسرے کے لئے سماج ذمہ دار ہے - اگر یہ دو مصیبتیں نہ ہوں تو ہمارے ادیب کی حزنیت بہت کم ہو جائے گی اور پھر فراق یار کے علاوہ بہت کم چھڑیں اسے رنج دیا کریں گی - اگر سماج اور قدرت کے نظام میں ایسی تبدیلی ہو کہ یہ فضا بدل جائے تو ایسے جذبات بھی پیدا نہ ہوں گے -

اب تک ہمارے تنقید نگاروں نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ ادیب نے جذبات کو کس طرح ظاہر کیا ہے۔ (Form) کی اہمیت سے کسے انکار ہو سکتا ہے۔ لیکن اگر یہ سمجھ لیا جائے کہ ادیب جن جذبات کو آشکار کر رہا ہے وہ الہامی نہیں بلکہ ماحولی ہیں تو یہ سوال زیادہ اہم ہو جاتا ہے کہ ان جذبات کو کون اور کیوں ظاہر کر رہا ہے۔ ادیب سماج کے مطالبات اور اپنے گرد و پیش سے ہر انسان کی طرح متاثر ہوتا ہے۔ وہ جس زمانے میں جس تہذیب و تمدن کی گود میں پرورش پائے گا، جن لوگوں کے ساتھ رہے گا اور جن روایات و خیالات کا حامل ہوگا — وہ یقیناً اس کے جذبات کو رنگ روپ دیں گے، اس لیے میری ناچیز رائے میں کسی ادیب کی روح کو سمجھنے کے لئے اس فضا کو سمجھنا زیادہ ضروری ہے جس میں اُس نے پرورش پائی۔ جب تک اس زمانے کی زندگی نہ سمجھی جائے یہ سمجھ میں نہیں آسکتا کہ ادیب نے یہی کیوں کہا، اس کے خلاف کیوں نہیں کیا۔ اس لئے کہ ادیب اپنے جذبات کی نہیں اپنی فضا کے جذبات کی توجمانی کر رہا ہے۔ اس کی زبان سے اجتماعی انسان بول رہا ہے —

فرض کیجئے کہ کسی شہر میں ایک کارخانہ بنایا جاتا ہے۔ اس کی تعمیر کی ظاہری صورت یہی ہے کہ ایک امیر نے سرمایہ لگایا انجنیئر نے نقشہ بنایا اور مزدوروں کی محنت نے سرمایہ کھڑا کر دیا۔ لیکن واقعہ تو یہ ہے کہ جب تک اقتصادی ضروریات کا مطالبہ نہ ہوتا کہ کارخانہ بنایا جائے اس وقت تک اس کا خیال بھی کسی کے ذہن میں نہ آتا۔ کارخانے کی وجہ تعمیر کو سمجھنے کے لئے اس زمانہ کی مالیات پر غور کرنا چاہئے نہ کہ اس سیتھہ کی تھیلی کی لمبائی اور انجنیئر کے نقشہ کی

ستھرائٹی پر - اسی طرح کسی زمانے کے ادب کا غائر مطالعہ مقتضی ہے اُس زمانے کے حالات کو سمجھنے کا کہ اُن مخصوص جذبات کو اُن مخصوص حالات نے ہی پیدا کیا تھا - سنسکرت شاعری جن جذبات کی حامل ہے وہ قدیم ہند کے اساطیر (Myths) کے پس منظر میں ہی سمجھے جاسکتے ہیں - سماج اپنے عہد طفلی میں اپسراؤں \* اور راکشسوں کے افسانے سن اور سمجھے جاسکتے ہیں لیکن اب اپنے زمانے پوری میں وہ ان رنگین خوابوں کا تانا بانا کیوں کر بن سکتا ہے جب کہ اپسرا کی جگہ سیلما کی طوائف اور راکشس کا نمبر روبت † (Robot) نے چھین لیا ہے اب شمع پر پروانے بھی کم آتے ہیں کہ آگ کی جگہ بجلی آگئی اور خرمن پر برق بھی کم گرتی ہے کہ اس پر برقی سلاح نصب کر دی گئی ہے! صحراؤں میں محصل کا پتلا نہیں کہ موٹر چلنے لگے اور دہلیوں کا رواج بھی کم ہو چلا کہ کہاروں کے کاندھے چھل گئے - زمانے کے رد و بدل نے سنسکرت شاعری کے پرنوچ لیے اور احساسات و جذبات کی تبدیلی کا یہ مطالبہ ہوا کہ ہندوستانی ادب کا دھارا اپنے بہاؤ کے لیے نیا میدان تلاش کرے -

اب یہ دیکھنا ہے کہ ادب کے فرائض کیا ہیں - مہرا مطلب اُن کے مقصد سے نہیں ہے - طالسٹائی کا یہ مقولہ بالکل صحیح ہے کہ آرت جذبات انسان کو متاثر کرنے کا ایک ذریعہ ہے مغنی ایک یاس انگیز نغمہ چبھرتا ہے اور سننے والے بلا امتیاز اندوہ و الم سے چبھتے آتے ہیں - شاعر طرب و نشاط کا گیت سناتا ہے تو سننے والے شادمان ہو جاتے ہیں - دستوویسکی جب ”گناہ اور سزا“ میں ایک روح کی کشمکش دکھاتا ہے تو ناظر کی روح میں گتھی سی پڑ جاتی ہے - ادیب کے کمال کا ایک معیار

یہی ہو سکتا ہے کہ اپنے جذبات سے وہ دوسروں کو کس حد تک متاثر کر سکا۔ اُس کی عبارتِ زمان و مکان کے امتیاز سے جتنی بالاتر ہوگی، اس کا آرت اتنا ہی دیرپا اور مستحسن سمجھا جائے گا۔ مگر وہ اپنے ماحول سے جدا نہیں ہو سکتا اپنے ماحول کے تاثرات کو بیان کرتا ہے یعنی اپنے ماحول سے لوگوں کو متاثر کرتا ہے۔ جب تلسی داس ایک زن مرید باپ کی اطاعت کو بیٹے کا دین و مذہب بتلاتا ہے تو اُس کے قلم سے اُس زمانے کی تہذیب بولتی ہے جس میں بیٹے کی حیثیت باپ کی غہر منقولہ جائداد سے زیادہ نہ تھی۔ آج جب ہر بیٹا اپنی انفرادیت کو شہمت پدری سے زیادہ قیمتی سمجھ رہا ہے تو اس قسم کی تعلیم رجعت اور قدامت سے تعبیر کی جائے گی۔

یہاں فوراً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آرت کا مقصد کیا ہے :

’ادب برائے ادب‘ کے علم برداروں کا خیال ہے کہ روح اور خدا کی طرح ادب بھی کوئی مافوق الدامین (Super Organic) شے ہے اور جس طرح حسن و حقیقت کو عام معیار پر نہیں جانچا جاسکتا اسی طرح ادب سے سرور و حظ اسی حالت میں حاصل کیا جاسکتا ہے کہ اسے سماج کی پابندیوں سے الگ رکھا جائے۔ جمالیاتی نقطہ نظر، جس کے موئید ہیگل، شوپین، ہورڈ فکس اور بہت سے انگریز ادبا اور مفکرین ہیں، آرت کا مقصد تلاشِ حسن کو قرار دیتے ہیں۔ اخلاقی نقطہ خیال جس کی تشریح طالسٹائی نے کی، آرت کو نیکی کا آئینہ دار قرار دیتا ہے۔ معاش اور مادی نقطہ نگاہ سے یہ دونوں معیار مبہم اور ادھورے ہیں۔ اگر یہ صحیح ہے کہ ادیب انسان ہے اور ہر انسان کی طرح ماحول متاثر ہوتا ہے اور اگر یہ حقیقت ہے کہ ادب نگاری بھی ایک قسم کا سماجی عمل ہے اور انسانیت اس سے اثراندوز ہوتی ہے۔ تو ادب اور انسانیت کے مقاصد ایک ہوں۔

ادب زندگی کا ایک شعبہ ہے اور کوئی وجہ نہیں کہ مادی سرزمین میں جذبات انسانی کی تشریح و تفسیر کرتے ہوئے وہ روح القدس بننے اور عرش پر جا بیٹھنے کا دعویٰ کرے۔ زندگی کا تہا نچا مکمل اور واحد ہے۔ اس میں سائنس آرت اور فلسفہ کے مختلف خانے نہیں ہیں کہ جس کا جی چاہے کہہ دے کہ مجھے زندگی سے کیا غرض، میں آپ اپنے لئے زندہ ہوں! اور چیزوں کی طرح فن و ادب بھی زندگی کے پروردہ اور خادم ہیں۔ ادب ماضی و حال اور حال و مستقبل میں رشتہ جوڑتا ہے۔ رنگ و نسل اور ملک و قوم کی بندشوں کو توڑ کر وہ بلی نوع انسان کو وحدت کا پیغام سماتا ہے۔ کوئی وجہ نہیں کہ اتنے اہم معاشی فریضے کو ایک فن کار اپنی ذاتی ملکیت سمجھے اور اس کا یہ دعویٰ تسلیم کر لیا جائے۔ حسن کیا ہے جس کی تلاش میں مدعیان ادب براے ادب مدتوں سے سرگرداں ہیں؟ حسن کی تعریف ناممکن سی ہے۔ والتیر نے اپنی مشہور تصنیف (Dictionaire de Philosophie) میں ان لوگوں کا بڑا مذاق اڑایا ہے جو حسن کا کوئی معیار قائم کرنا چاہتے ہیں۔ وہ لکھتا ہے کہ مہلذکی کو بھی اپنی نرم اور چمکدار جلد پر خوبصورتی کا دعویٰ ہے اور ایک حبشی حسینہ کے چہرے اور موٹے ہونٹوں پر بھی عاشقوں کا گروہ دل و جان قربان کرتا ہے۔ جرمنی کے کلاسکل فلاسفروں کے نزدیک یہ وہ چیز نہیں ہے جو آدمی کو خوش کرتی ہے۔ اس کے یہ معنی ہوئے کہ ادب کا مقصد اولیٰ تفریح طبع ہے اور چونکہ دعویٰ یہ بھی ہے کہ آرت زندگی کا اہم ترین شعبہ ہے لہذا تفریح زندگی کی معراج ہوئی! پھر ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک آدمی جس چیز سے مسرور ہوتا ہے وہ دوسرے کے لئے اجہرن ہے۔ زندگی اور ادب کا یہ نظریہ اس قدر بے معنی ہے کہ اس پر کچھ لکھنا فضول ہے۔ پھر کیا آرت کا مقصد تلاش حق ہے؟ حقیقت

کیا ہے! کیا حقیقت کی کوئی قطعی اور آخری تعریف ہو سکتی ہے جو سب کے لیے قابل قبول ہو؟ جو چیز ایک کے لیے اچھی ہے دوسرے کے لیے بُری - اور  
 کے لیے جو حق ہے وہ غریب کے لیے ناحق ہے - پھر ادب کس حقیقت کا جوہا ہے -  
 میں پھر اپنے جملے کو دہراتا ہوں کہ زندگی کے مقاصد سے ہمت کر  
 ادب نہ اپنی منزل تلاش کر سکتا ہے اور نہ یہ ممکن ہے - زندگی کی روانی  
 اسے اپنے ساتھ چلنے کے لیے مجبور کرتی ہے ' عام اس سے کہ وہ اپنے آپ کو  
 رموز حیات کا محترم اور حسن و عشق کا پروردگار کہتا رہے - ایک انسان  
 اور ایک ادیب کے فرایض و مقاصد یکساں اور مشترک ہیں - فرق صرف اتنا  
 ہے کہ ایک اپنے ماحول کی ترجمانی کرتا اور دوسرا اس سے متاثر ہوتا ہے -  
 یہ صحیح ہے کہ دنیاے ادب میں ایسی بیسیوں مثالیں ملیں گی کہ ادیب  
 اپنے ماحول سے بے خبر اور آزاد ہو کر آگے یا پیچھے جانا چاہتا ہے - اپنے موقع  
 پر ایسی واردات کے اسباب پر بھی غور کیا جائے گا اور ہم دیکھیں گے کہ یہ  
 حالات کا ہی رد عمل تھا، کوئی الہامی کیفیت نہ تھی -

اب تک ہم جن نتائج پر پہنچے وہ یہ ہیں -

(۱) ادب زندگی کا ایک شعبہ اور اپنے ماحول کا ترجمان ہے -

(۲) زندگی اور ادب کے مقاصد ایک ہیں -

زندگی کے مقاصد کو سمجھنے کے لیے سوسری طور پر ہمیں سماج کی  
 بنیاد کا جائزہ لینا اور یہ دیکھنا ہوگا کہ سماج کیوں بننا اور بگڑتا ہے  
 اور یہ تبدیلیاں اسے کس منزل کی طرف لے جا رہی ہیں -

سماج ایسے افراد کا مجموعہ ہے جو اشتراک عمل کے لیے یک جا ہوتے  
 ہیں - اشتراک اور تعاون کے لیے ان افراد کا مقصد یکساں ہونا ناگزیر ہے -  
 ہر فرد کی مادی ضروریات کم و بیش ایک سی ہوتی ہیں اور سماج کی

ابتداء اس غرض سے ہوتی ہے کہ ضروریات زندگی کے حصول و تقسیم میں آسانی ہے۔ یعنی سماج کا سنگ بنیاد انسان کی مالی ضروریات کی پیداوار اور تقسیم پر ہے اور افراد کا رشتہ باہمی اس پیچ و خم کے ساتھ ساتھ بدلنا رہتا ہے۔ سماج کی ترقی سے مراد یہ ہے کہ اس کے افراد کا رشتہ مستحکم ہوتا جاتا ہے یعنی ضروریات زندگی کی بہم رسانی آسان ہوتی جاتی ہے جس سے انہیں اپنی خواہشوں کی تکمیل کا موقع ملتا ہے۔ پیداوار کے ذرائع جتنے وسیع اور کارآمد ہوں گے اور سال کا طریقہ تقسیم اکثریت کے لیے جتنا قابل قبول ہوگا اسی اعتبار سے نظام معاشی کی عمر دراز ہوگی۔ سماج کے ارتقا سے مراد دراصل پیداوار کے انہیں ذرائع کے ارتقا سے ہے۔ دور وحشت سے گزر کر انسان دور حرفت میں کیسے پہنچ گیا، اسے سمجھنے کے لئے یہ دیکھنا ہوگا کہ کلمہ بازی نے تریکٹر کی شکل کس طرح اختیار کر لی اور نیزہ مشین کن کیسے بن گیا۔ پیداوار کے ذرائع دو حصوں میں منقسم کیے جاسکتے ہیں۔ ایک طرف تو قدرتی ذرائع و عناصر ہیں جنہیں حسب ضرورت کارآمد بنانا ہے اور دوسری طرف وہ انسانی مہمت ہے جو یہ فرض انجام دیتی ہے۔ زمین کان اور خام اشیا کی دوسری قدرتی رسد گاہیں جہسی پہلے تھیں ویسی ہی اب بھی ہیں۔ ان میں فرق نہیں آتا۔ سماج کا ارتقا و تغیر محتاج ہے انسانی مہمت کا، جو ان اشیا کو قابل استعمال بناتی ہے۔ جس کھپت میں کاشتکاری کے فرسودہ طریقوں سے دس من غلہ پیدا ہوتا تھا آج وہاں مشینوں سے سیکڑوں من اناج پیدا ہوتا ہے۔ یہ پیداوار کے ذرائع کی ترقی ہے جسے ہم سماج کی ترقی سے تعبیر کرتے ہیں۔ پہلے یہ کہا جا چکا ہے کہ نظام معاشی کا بنیادی پتھر، ضروریات زندگی کی پیداوار پر رکھا گیا ہے اور سماج اسی

وقت تک قائم ہے جب تک اس کے افراد کا رشتہ باہمی مستحکم ہے جس کی ضمانت ہر فرد کی ضروریات کی تکمیل ہے۔ اس سے یہ لازم آیا کہ پیداوار اور تقسیم کے طریقے ایسے ہونے چاہئیں کہ ہر فرد اپنی بساط کے مطابق محنت کر کے اپنی ضروریات حاصل کر سکے۔ یعنی پیداوار اور تقسیم کا ارتباط رشتہ افراد کے استحکام کا ضامن ہو سکے۔ ہر فلسفہ زندگی کا منشا یہی ہے کہ ہر فرد بشر کو روحانی، ذہنی و جسمانی نشوونما کا موقع مل سکے۔ مگر انسان کا مادی وجود اس کا مقتضی ہے کہ سب سے پہلے اس کی جسمانی ضروریات کا انتظام ہو۔ سرمایہ دولت یا امارت سے وہی لوگ بہرہ مند ہوتے ہیں جو پیداوار کے ذرائع پر کسی نہ کسی طرح قابض ہوتے ہیں۔ غریب و فقیر وہ لوگ ہیں جو ان کی ملکیت سے محروم ہیں۔ اگر کبھی ایسا ہو سکے کہ پیداوار کے ذرائع پر کوئی ایک طبقہ نہیں بلکہ پورا سماج قابض ہو اور مال کی تقسیم اس طرح ہو کہ ہر محنت کش فکر روزگار سے آزاد ہو جائے اور آئندہ نسل کی تربیت و پرورش کی کفالت و تحفظ سماج کر سکے، تو یہ سماج کی مادی ترقی کی انتہا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ وہ ذہنی و تمدنی اعتبار سے بھی انسانیت کو مرتبہ بلند کی طرف لے جاسکے گا، اور اس وقت روح الاجتماع خداوند بن جائے گی اور کثرت و وحدت میں کوئی تذازع نہ رہے گا۔ یہ زندگی کا مقصد اولیٰ ہے اور اس کا تقاضا ہے کہ اس کا ہر شعبہ اس کے حصول کے لئے کوشاں ہو۔

اسی چیز کو مدنظر رکھ کر ادب جدید کا پیغمبر 'میکسم گورکی' کہتا ہے: ادب انسانیت کا نقاد ہے۔ وہ اس کی کجروی کو ظاہر کرتا اور اس کی خامکاریوں کو بے نقاب کرتا ہے۔ اس کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انسان کی حیات مستعار کو دائم و قائم بنائے۔ ادب کی بیکالی

اور توپ اس لئے ہے کہ آدمی کو سمجھائے کہ وہ حالات کا غلام نہیں ہے بلکہ حالات اس کے غلام ہیں - وہ آدمی کو بتلانا چاہتا ہے کہ وہ آپ اپنی زندگی کا مالک ہے اور اسے جس روہں پر چاہے لے جاسکتا ہے - اس لحاظ سے ادب تغیر پسند قدامت شکن اور دور جدید کا پیش رو ہے -

ادب زندگی کے اس سوال کا جواب ہے کہ انسان کس سے محبت اور کس سے نفرت کرے اور کس طرح زندہ رہے - یہ سچ ہے کہ تدریسیات سے اسے کوئی واسطہ نہیں - روگی انسانیت کو وہ پزند و نصیحت کی کڑوی دوا نہیں پلاتا بلکہ ہلکے اور میتھے مردوں سے اس کی عیادت کرتا ہے - اس میں شبہ نہیں کہ ادب کے ماخذ ماضی و حال نہیں لیکن وہ مستقبل کا جو یا ہے - وہ پوچھے یا دائیں بائیں طرف اس غرض سے دیکھ لیتا ہے کہ ملزل حیات کے نشیب و فراز کو دیکھ سکے اور آگے بڑھ سکے - تاریخ کے معاذ میں اس کی جگہ صرف آخر میں نہیں بلکہ پیش پیش ہے - لہذا ادب کا یہ مقصد ہے کہ زمان و مکان کی حد بندیوں سے بالاتر ہوتے ہوئے بھی اپنے گرد و پیش کا آئینہ دار ہوتا کہ اس کے حسن و قبح سے آگاہ ہو کر انسانیت ترقی کے زینوں پر گامزن ہو - علم اور ادب میں وہی فرق ہے جو استاد کی دھمکیوں اور ماں کی لوریوں میں - ادب وہ استاد ہے جو کہانیوں اور گیتوں میں انسانیت کو رموز حیات سمجھاتا ہے - ادب کا مقصد یہ ہونا چاہئے کہ وہ ان جذبات کی ترجمانی کرے جو دنیا کو ترقی کی راہ دکھائیں ان جذبات پر نفرین کرے جو دنیا کو آگے نہیں بڑھنے دیتے اور پھر وہ انداز بیان اختیار کرے جو زیادہ سے زیادہ لوگوں کی سمجھ میں آسکے - کیونکہ بہر حال زندگی کا مقصد یہی ہے کہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کا زیادہ سے زیادہ بہلا ہو سکے -

ادب ہند کا ایک خاکہ پیش کر کے ہم یہ دیکھینگے کہ وہ کہاں تک مذکورہ مقصد کا حامل رہا ہے کیا وہ زندگی کے حقائق اور مقاصد کی ترجمانی کرتا رہا ہے اور کہا وہ انسانیت کا مصلح اور پیشوا کہا جاسکتا ہے۔ ابھی صرف یہ دیکھنا ہے کہ ہمارے ادیب عموماً کس ماحول میں رہتے آئے ہیں کیونکہ ہمارے تجزیہ کے مطابق اُن کے جذبات کی شکل اسی ماحول میں ہوئی۔ کیا یہ ماحول اور یہ جذبات زندگی کے لئے چراغِ راہ بن سکتے ہیں؟ اب زندگی کو کس طرف جانا چاہئے اور ہمارا ادب کس طرف جا رہا ہے؟

زمانہ قدیم اور عہدِ وسطیٰ بلکہ گزشتہ صدی کے اواخر تک علم و ادب پر دو قسم کے لوگوں کا اجارہ رہا ہے۔ ایک وہ جو بھراگی یا صوفی تھے اور دوسرے وہ جو طبقہٴ امرا سے تعلق رکھتے تھے اور زندگی کی تگ و دو سے ان کا کوئی تعلق نہ تھا۔ آشرموں یا حجبوروں میں اور درباروں یا امہروں کی دیورزہوں میں پڑے ہوئے یہ عالم اور ادیب زندگی کے مسائل کو سمجھنے سمجھانے کی کوشش کیا کرتے تھے۔ وہ ایک ایسے ماحول میں رہتے تھے جو یا تو زندگی سے دور تھا اور یا جھوٹی زندگی کا عکاس تھا۔ سوچئے کہ دربار یا آشرم میں رہ کر انسان کین جذبات کی ترجمانی کن کی زبان میں کرے گا۔ ایک محدود دائرے میں رہ کر جہاں ایک سے لوگ ایک قسم کی زندگی بسر کرتے ہیں، جہاں حزنیت یا منافقت کا دور دورہ ہے۔ وہاں کسی ادیب کی حالت کیا ہوگی! اس لحاظ سے ہمارے ادب قدیم کے تین نقائص اتنے نمایاں ہیں کہ حاشا تشریح طلب نہیں:

۱۔ موضوعات ادب بہت ہی نرسودہ اور محدود ہیں۔

۲۔ لطف بیان اور زیب داستاں پر معنی و مقصد قربان کئے جاتے ہیں۔

۳۔ ادب کو لوگ پیشہ کی حیثیت سے اختیار کرتے ہیں -

تاریخ بتاتی ہے کہ اس ملک کا ادب ہر دور میں طبقہ امرا کا خادم اور منت پذیر رہا ہے - کچھ صوفی شاعر اور عہد وسطیٰ کی 'بھکتی تحریک' کے علم بردار ادیب ایسے ضرور ہوئے ہیں جو امیروں کے دست نگر نہ تھے لیکن ان میں سے اکثر دنیا سے بیزار اور بے نیاز تھے جس کی جھلک ان کے کلام میں موجود ہے - کبیر داس اور نظیر اکبر آبادی جیسے شاعر خال خال ہی ہوئے ہیں جو کھوم پھر کر آپ اپنی روٹیاں کھاتے، اور زندگی کو کوچہ یار میں رہ کر نہیں بلکہ قدرت کے نگار خانے میں رہ کر سمجھنے کی کوشش کرتے تھے - ان درباری بھائیوں اور بے غیرت عاشقوں کے متعلق طالسٹائی کہتا ہے :

” کیونکہ ان کا پیشہ امیروں کی خوشنودی ہے اس لئے ان میں خود داری کا احساس باقی ہی نہیں رہتا - قبول عام کی ہوس میں یہ اندھے ہو جاتے اور مدح و ثنا پر اپنا دین و ایمان نثار کر دیتے ہیں - یہ دیکھ کر کتنا افسوس ہوتا ہے کہ آرت کی خاطر یہ زندگی کے لئے بیکار تو ہو ہی جاتے ہیں لیکن یہ ہمہ آرت کو فائدہ کیا لےنا نقصان پہنچاتے ہیں - علاوہ بریں یہ لوگ امیروں کی غیر فطری زندگی کو اس قابل بنا دیتے ہیں کہ وہ بھزار ہو کر مر نہیں جاتے بلکہ حسن و عشق کی دنیا میں اپنی روح کو تلاش کرنے کا دلچسپ مشغلہ اختیار کرتے ہیں - امیروں کو آرت یہ تلقین کرتا ہے کہ انسان نہ کی کے لئے نہیں بلکہ حسن پرستی یعنی عیاشی کے لئے زندہ ہے - امیروں کے زیر سایہ جو غریب رہتے ہیں وہ بھی ان مکروہ جذبات سے

اثر پذیر ہوے بغیر نہیں رہ سکتے جن کی ترجمانی آرت کر رہا ہے۔ چنانچہ لوگوں میں وطن پرستی اور اوباشی کے اثرات سرعت سے پھیلنے جاتے ہیں۔ یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ ہمارے زمانے کے آرت کا وہی حشر ہوا جو ایک عشوہ فروش ہر جاٹی کا ہوتا ہے۔ آرنسٹ فصاحت و بلاغت، عبارت آرائی اور رنگین بھائی میں اپنی ضمیر فروشی اور نفس پروری کو چھپاتا ہے، طوائف روغن و غازہ سے اپنی بد صورتی پر پردہ ڈالتی ہے۔ غرض کہ ہمارے زمانے اور ہمارے طبقے کے آرت اور کسی کسی میں ذرا فرق نہیں۔ یہ تشبیہ لفظ بہ لفظ صحیح ہے۔ آرت اتنا ہی خود فروش، سیاہ باطن اور فریب کار ہے!

یہ باتیں ہندوستان کے قدیم اور جدید ادب کے لئے زیادہ سچائی کے ساتھ کہی جاسکتی ہیں۔ دوسرے ممالک میں بھی ادیب اور فن کار ہرزہ سرائی کرتے رہے ہیں لیکن ہم دیکھیں گے کہ ہمارے ادب کی حالت اور بھی ناکفتمہ رہی ہے۔ زمانہ حال کا سحر طراز ادیب درو ماں رولاں ادب کے اس رویہ کے خلاف احتجاج کرتا ہوا کہتا ہے۔ ”پچھلی صدی کے ادیبوں اور فن کاروں نے سماج کے ضمیر کو سلا دیا ہے۔ سماج کی ذمہ داری سے بچنے کے لئے انہوں نے لوگوں کو نئے نئے بھانے سکھا دیئے ہیں اور حقیقت سے بچنے کے لئے نئے نئے بت خانے کھڑے کئے ہیں۔ ان کی تاویلوں کے بعد ہر شخص کے لئے یہ کہنے کی گنجائش پیدا ہو گئی ہے کہ سماج کے مظالم اور ستم خیزیوں کے لئے میں ہرگز ذمہ دار نہیں ہوں!“

آج ادیبوں کی حالت کیا ہے۔ جو پیشہ ور ہیں وہ فلم کمپلیوں، جاہل نتمب فروشوں اور تن آسان ناظروں کے ساتھ خود کو بیچ رہے ہیں۔

جو شوقیہ لکھتے ہیں وہ نہ زندگی کو سمجھتے ہیں اور نہ سمجھ سکتے ہیں - زندگی کھیٹوں اور کارخانوں میں ہے نہ کہ آرام کرسیوں اور آراستہ ایوانوں میں - پھر جب کبھی ان سے کہا جاتا ہے کہ تمہارے فرائض و متناصل کم از کم ایک معمولی انسان جیسے تو نہیں انہیں ان خوش گوار حالات کو بدلنے کی کوشش کرنی چاہئے تو یہ بلڈگان خدا 'ادب' پر اے 'ادب' کی دھائی دینے لگتے ہیں - مطلب یہ ہے کہ ہم اپنے لیے زندہ ہیں! تو پیسوں اور جوتیوں کی طرح بازار کی ضرورت کے لحاظ سے کتابیں لکھتے ہوے اور مشاعروں کی تحسین و آفرین اور امیروں کے مہر و کرم کے خیال سے تک بندی کرتے ہوے بھی یہ لوگ بیباکی سے کہتے ہیں کہ آرت صرف انفرادی آزادی کی فضا میں پنپ سکتا ہے - انہیں مخاطب کر کے 'لیٹن' اپنے اخبار نووازیجن میں ایک جگہ لکھتا ہے : ” ہم ادب کو کامل طور پر آزاد کرنا چاہتے ہیں - صرف سیاسی بلڈشوں سے ہی نہیں بلکہ دولت اور خود غرضی کی پابندیوں سے بھی ہم اسے آزاد کر دیں گے - یہی نہیں بلکہ ہم اسے سرمایہ دارانہ انفرادیت کا خادم بھی نہ رہنے دیں گے -

یہ آخری الفاظ ناظرین کو متضاد معلوم ہوں گے - ممکن ہے کہ کوئی آزادی کا پرستار ادیب چیخ اُٹھے کہ تم سماج کی چکی میں آرت کو پیسنا چاہتے ہو، تم اس تخلیقی صلاحیت کو معدوم کرنا چاہتے ہو جو مکمل انفرادی آزادی کی فضا میں ہی پروان چڑھ سکتی ہے - میں کہتا ہوں کہ یہ لمحے چورے دعوے تمہاری مذاقت کے ثبوت ہیں - جس سماج کی بنیاد کیسٹ زر پر رکھی گئی ہے، جہاں معدودے چند سیٹھہ عیش اور مزدور فاقہ کشی کرتے ہیں، وہاں آزادی کا ذکر تک مضحکہ خیز ہے - میں مصلحتوں سے پوچھتا ہوں کہ کیا وہ سرمایہ دار پبلشروں کے دست نگر نہیں ہیں؟

کیا وہ عہدِ طبع ناظرین کے زیرِ احسان نہیں ہیں جو ننگی تصویروں کے دلدادہ ہیں کیا ان کی خاطر 'ادب برائے ادب' میں طوائفوں کا ذکر مسعود نہیں کرنا پڑتا؟ سماج میں رہتے ہوئے آپ سماج سے الگ نہیں ہو سکتے۔ کسی سرمایہ دار مصنف، آرٹسٹ اور ایکٹر کا دعویٰ آزادی — اُس کی جہالت کا پردہ ہے!"

صحیح ادب کا معیار یہ ہے کہ وہ انسانیت کے مقصد کی ترجمانی اُس طریقے سے کرے کہ زیادہ سے زیادہ لوگ اُس سے اثر قبول کر سکیں۔ اس کے لئے دل میں خدمتِ خلقی کا جذبہ پہلے ہونا چاہئے کیونکہ ادب پیغمبری کی طرح خود گزاری کا مقتضی ہے نہ کہ ملائیت کی طرح پیشہ ور! ماضی 'حال اور مستقبل کو سمجھنا ادیب کے لئے ضروری ہے تاکہ اس کی درد مندی رائیگاں نہ جائے اور وہ تاریخ کے اشاروں کو سمجھا سکے۔ پھر زندگی کو اسی وقت سمجھا جا سکتا ہے جب اس کی آگ میں تپا جائے اور اس کے ہلکاموں میں حصہ لیا جائے۔ اس کی تگ و دو سے الگ رہ کر اس کے رموز کو سمجھنے کی کوشش ویسی ہی ہے جیسے ساحل پر کھڑے ہو کر دریا کی کپڑائی کا اندازہ لگانا۔ اس صورت میں نہ ادیب زیادہ لوگوں کے احساسات کو سمجھ سکتا ہے اور نہ اپنی زبان اور پیغام اُن تک پہنچا سکتا ہے۔ یہ معیار بہت بلند اور مشکل معلوم ہوگا اُس لئے کہ اب تک ادب پر اس جماعت کا قبضہ رہا ہے جو کسی راجہ کے مشہور درباری کی طرح ندی کی لہریں گڈنے کی تذخوہ لیا کرتا تھا —

پوچھا جائے گا کہ ادب و شعرا کون سی راہ اختیار کریں۔ اپنے تخیل اور تخلیق کی باگ کس طرف موزیں کہ زندگی کی شاہراہ سے آملیں جس سے ہلوڑو بہت دور رہے ہیں۔ روس کا مشہور ملکر 'پرنس کرو پائین'

جواب میں کہتا ہے : ” اگر تمہارے دل میں بنی نوع انسان کا درد ہے ، تمہارے جذبات کا رباب اُن کے دکھ سکھ کے ساتھ ہم آہنگ ہوتا ہے اور اگر ایک حساس انسان کی طرح تم زندگی کے پیغام کو سن سکتے ہو — تو تم ہر قسم کے ظلم کے مخالف ہو جاؤ گے ! جب تم کروڑوں آدمیوں کی فاقہ کشی پر غور کرو گے ، جب تم مہدان جنگ میں لاکھوں بے گناہوں کے لاشے تڑپتے دیکھو گے ، جب تمہارے بھائی بزد قہد و بزد اور دار و سن کے مصائب جھیلتے نظر آئیں گے ، اور جب تمہاری آنکھوں کے آگے دلیری کے مقابلے میں بزدلی اور نیکی کے مقابلے میں بدی فتح یاب ہوگی — تو ادیبو اور شاعرو ، اگر تم انسان ہو تو ضرور آگے آؤ گے ! تم ہرگز خاموش نہیں رہ سکتے — تم مظلوموں کی طرف داری کرو گے کیونکہ حق و صداقت کی حمایت ہر انسان کا فرض ہے ۔“

ہر ایمان دار اور صادق ادیب کا مشرب یہ ہے کہ قوم و ملت اور رسم و آئین کی پابندیوں کو ہٹا کر زندگی کی یگانگی اور انسانیت کی وحدت کا پیغام سنائے ۔ اُسے رنگ و نسل اور قومیت و وطنیت کے جذبات کی مخالفت اور اخوت و مسارات کی حمایت کرنی چاہئے اور ان تمام عناصر کے خلاف جہاد کا پرچم بلند کرنا چاہیے جو دریائے زندگی کو چھوڑتے چہہ بچوں میں بزد کرنا چاہتے ہیں ۔ کیا زمانہ حال کا ادیب یہ کرے گا ؟ اب تک وہ قدامت اور رجعت ، خود پرستی اور ظلم پروری کا ساتھ دیتا رہا ہے جس کی مثالیں ہم نے مضمون کے دوسرے باب میں پیش کی ہیں ۔ گو یہ تبصرہ مختصر ہے تاہم مجھے یقین ہے کہ غور و فکر کے لیے تھوڑا سا سامان ضرور مہیا کرے گا —

### قدیم ادب ہند کا معاشی تجزیہ

پلاسی کی لڑائی ساملتی اور حرفتی تہذیبوں کی تکرر تھی - اس کے بعد پورے ایک سو سال تک ہندوستانی سماج کا شیرازہ ملتشر ہوتا رہا اور سنہ ۵۷ ع کی آخری کشمکش کے بعد ساملتی تمدن نے ہتھیار ڈال دیے - اور یہ معلوم ہو گیا کہ کرکھوں اور ہلوں کے دن گئے اور مشیوں کا زمانہ آ گیا - تاہم حرفتی تمدن کا اثر سنہ ۵۷ ع کے بعد زیادہ نمایاں ہوا جس کی کونج پہلے راجہ رام موہن رائے کی مغرب دوستی اور بعد ازاں سر سید کی انگریز پروری میں سنائی دی - ہندوستان کی زندگی میں انقلاب سا آ گیا جس کی رو میں پرانی روشنی کے چراغ گل ہونے لگے - جیسا کہ عرض کر چکا ہوں میں نے اسی اعتبار سے ادب ہند کے دو دور مقرر کیے ہیں - کیونکہ اس سے پہلے ہزاروں سال تک ہمارے سماج کی حالت یکساں رہی - پیداوار کے ذرائع ایک سے رہے اور تقسیم کے اصولوں میں بھی کوئی فرق نہ آیا - مقامی حالات میں عارضی طور پر خیرات یا تحط کی وجہ سے یونہی سی تبدیلی ہو جاتی تھی ورنہ وہی آسان تھا اور وہی زمین -

دنیا کے ہر گوشے میں ساملتی تمدن طبعاً امرا پر رزم اور بزم کے نتوش چھوڑ جاتا ہے - اس کی پوری زندگی خون آشامیوں یا رنگ رلیوں میں گزر جاتی ہے - ہند قدیم کی تہذیب عوام اور امرا کو مذہبی اعتبار سے بھی دو طبقتوں میں بانٹتی اور علم و ادب \* کو صرف برہمنوں کا

اجارہ قرار دیتی ہے۔ رفتہ رفتہ کشتریوں اور ویشیوں میں بھی علم و فن کے چرچے ہونے لگتے ہیں لیکن عوام الناس یعنی شودروں کو نہ انہیں حاصل کرنے کی فرصت ہے نہ اجازت۔ بیچارگی سے قذاعت اور اس سے قسمت پرستی عبارت ہے اور پچھلے جنم کے ناکردہ گناہوں کے لیے شرمساری اور اکلے جنم کی کامرانیوں کا خیال خام ان میں دس جاتا ہے۔ پوری سنسکرت اور ہندی شاعری کو چھان ڈالیں، اساطیر اور افسانوں کا ورق ورق الٹ جائیے، شاذ و نادر ہی کہیں عوام کا ذکر آتا ہے اور وہ بھی نفرت و حقارت کے ساتھ۔ البتہ راجاؤں کو رعایا پروری اور عدل گستری کی تعلیم دی جاتی ہے کیونکہ رعایا کی خوشنودی ہی قیام حکومت کی ضامن ہے۔ سنسکرت کے قواعد ادب اسے لازم قرار دیتے ہیں کہ ہر ادبی تصنیف دیوتاؤں کے علاوہ حکومت اور برہمن جماعت کی دعائے خیر کے ساتھ شروع ہو۔ برہمنوں کی خداداد برتری اور کشتریوں کے اختیار حکومت کو بار بار دہرایا جاتا اور ان سے سرکشی کرنے والوں کو جہنمی اور لعنتی قرار دیا جاتا ہے۔ شودروں کو بار بار توکا جاتا ہے کہ اونچی جاتیوں کی خدمت ان کا فرض مذہبی اور دین و ایمان ہے۔ مذہب اور دیوتاؤں کی نگہ کرم ہمیشہ روح اور جسم کے خداوندوں کے لیے مخصوص ہے اور ہندو ادب ان کی مدح و ثناء سے لبریز ہے۔ 'شرنکارس' اور 'شاننرس' سنسکرت شاعری پر چھائے ہوئے ہیں کیونکہ ایک امیروں کے صنفی رجحان کو پرچاتا اور دوسرا بوڑھوں کے احساس گناہ کو کم کرتا ہے۔ خود فریبی کا یہ عالم ہے کہ فضا تریجیدی کے تذکرے تک کی متعصم نہیں اور اسے مخدوش سمجھتی ہے، چنانچہ ہر سنسکرت تریجیدی خواہ مخواہ کامیدی میں منتقل کر دی جاتی ہے!

اس سماج کا یہ طبقہ کس حد تک عیش و طرب میں توبا ہوا بزم کی رنگینہوں کی داد دے رہا تھا، اس کا اندازہ لگانے کے لیے اس زمانے کے ادب کو دیکھیے۔ اکثر سنسکرت افسانے مثلاً 'دش کمار چرتو' بہتال پنچہشت (بہتال پچھسی) اور 'مرچھہ کٹکا' (مٹی کی گاری) وغیرہ ندرامے بد اخلاقی، اوباشی اور قابل نفرت جنسی فساد سے بھرے پڑے ہیں۔ شاعر اور ادیب انہیں یوں مزے لے لے کر بیان کرتا ہے گویا زندگی کے فرائض یہیں ختم ہو جاتے ہیں۔ عشقیہ شاعری کے لیے جو ہم معنی لفظ 'شرنگار' ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ محبت اور بوالہوسی میں کوئی امتیاز نہ تھا۔ ہندو اصناف سخن میں 'نائیکہ بھید' اور نکیہ شکیہ ورنن یعنی اقسام معشوق کی شرح اور معشوقہ کے سراپا کو جو مرتبہ و مقبولیت حاصل ہے وہ اس کی شہوت پرست ذہنیت کا پر تو ہے۔ نائیکہ بھید میں جس تجسس اور انہماک سے صرف کدواری ہی نہیں بلکہ شادی شدہ عورتوں کی بد کاریوں کا تذکرہ کیا گیا ہے وہ ظاہر کرتا ہے کہ اس فضا کا اخلاقی معیار کیا تھا۔ شعر و ادب اس فضا کے لیے قوت باہ کی گولیوں کا کام انجام دیتے تھے۔ اس زمانے میں طبقہ امرا کی حالت کیا تھی اس کا اندازہ لگانے کے لیے مہابھارت کے کچھ واقعات پر غور کرنا دور از مبحث نہ ہو گا۔

جب ارجن نے کرشن جی کی بہن سبھدرا سے بیاہ کیا تو انہیں چھوڑ مہن ایک ہزار حسین و جمیل دوشیزائیں دی گئیں! یودھشتر نے جب 'راجسویہ' دیکھی، کیا تو انہیں راجاؤں نے ایک لاکھ حسینوں کے پارسل بھیجے! کرشن جی کی ۱۶ ہزار گویوں کا قصہ ممکن ہے کہ مبالغہ ہو لیکن مہابھارت اور بھاگوت میں ایسے صدہا واقعات موجود ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے حرم میں ہزاروں عورتیں رہتی تھیں۔ یہی نہیں یودھشتر کے

’دھرم راج‘ میں ۸۸ ہزار طلباء کی ضروریات حکومت کی طرف سے مہیا کی جاتی تھیں اور ان میں سے ایک اہم جلسہ یہ تھی کہ ہر طالب العلم کی خدمت کے لئے ۳۰ رو شہزائیں مقرر تھیں - لطف یہ ہے کہ سہا بھارت کا مصنف کہیں اشارتاً بھی اس شہوانی گرم بازاری کے خلاف ایک لفظ نہیں کہتا - یہ تو مشقے نمونہ از خزرارے ہے ورنہ عہد قدیم اس قسم کی بزم آفرینوں سے جگمگا رہا ہے! اس زمانے کے لوگ تاریخ نویسی سے بے بہرہ تھے، شعر و ادب میں ہی راوی نے چٹخارے بھر بھر کر یہ کہانیاں سنائی ہیں۔ یہ اس زمانے کی زندگی کا بزمیہ پہلو اور عشقیہ شاعری میں ماس کا عکس ہے - اب ششوپال ودہ راماین وغیرہ رزمیہ نظموں کو دیکھیے - قتل و غارتگری کا کوئی اثر قسم کھانے کے لئے شاعر پر نہیں ہوتا - حتیٰ کہ والمیٹک اور تلسی داس تک لڑکا کی تباہی اور لاکھوں انسانوں کے تہ تیغ ہونے پر اظہار تاسف نہیں کر سکے بلکہ بھواؤں کی آہ اور یتیموں کی فریاد پر یہ لوگ، خلدہ زن ہیں!

ملک کی آبادی کا ۹۵ فی صدی حصہ کسانوں پر مشتمل ہے لیکن میں نے آج تک کسی قدیم سنسکرت یا ہندی تصنیف میں ان کے حالات نہیں دیکھے - جا بجا درندوں اور پرندوں کے رنج و راحت کا حال ہے لیکن کسانوں کا نام تک کہیں نہ ملے گا - کبھی کوئی نیک طہنت وزیر راجا کے آگے ”پرچا“ کی تکالیف کا دکھوا روتا ہے یا کوئی راجا خیرات کرتا ہے تو احساس ہوتا ہے کہ اس ملک میں ’رعایا‘ نام بھی کوئی چیز تھی - ورنہ ’مائیوں‘ ’راجاؤں‘ بیٹیوں اور حسنینوں کے تذکرے اس کثرت سے ملینگے کہ یقین سا ہو جاتا ہے کہ اس جنت نشان میں ان کے علاوہ اور کوئی نہیں رہتا تھا!

کالیداس اس عہد کا مایہ ناز ادیب اور شاعر ہے - اس کی سحر طرازی اور جادو بیانی کا لوہا مشرق و مغرب میں سب نے مانا ہے - مظہر کشی اور تصویر نگاری میں وہ اپنا مقابل نہیں رکھتا - ایشیا کے شاعروں پر بجا طور پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ ان کا بیانیہ کلام تناسب سے دور ہوتا ہے - ایک کالیداس ہے جس کا ایک ایک لفظ نگہنے کی طرح جہاں جم گیا وہاں سے اُٹھ نہیں سکتا - کالیداس کی یہ حیثیت ہمیشہ قائم رہے گی - لیکن ماحول کا جیسا اثر جذبات پر پڑتا ہے اس کی سبق آموز مثال یہی شاعر بے ہمتا ہے - اس کے آگے انسانیت کا مقصد اگر کچھ ہے تو محض یہ کہ نیک دیوتاؤں، رحم دل راجاؤں اور ہت دھرم رشیوں کی پوجا کرے - شکنتلا میں جا بجا برہمنوں کی عظمت کا اعلان کیا گیا ہے 'رگھوونش' میں رام چندر جی کے اجداد کی فوج کشی اور بزم آرائی کا ذکر ہے - قدرت کے استبداد اور سماج کے مظالم کے خلاف وہ بھی کچھ نہیں کہتا اور اس کے کردار ایک ہی طبقے میں رہتے اور ایک ہی ماحول میں پرورش پاتے ہیں - کیونکہ 'ویدک' عہد میں آرام و آسائش کے سامان کم تھے اس لیے اس زمانے کی شاعری بھی تصنع سے پاک ہے - رفتہ رفتہ جاہ و حشمت کے طلسم کھڑے ہوتے اور عیش و طرب کے نئے نئے سامان مہیا کیے جاتے ہیں - ادب و شعر اس عروج یا زوال کی جو تصویر کھینچتے ہیں اس میں معنی آفرینی کی جگہ ندرت بیان اور لفظی بندشیں لے لیتی ہیں - یہ امر قابل غور ہے کہ علم بیان و معانی کے لیے سنسکرت میں 'الذکار' کا لفظ ہے جو 'زیور' کا ہم معنی ہے - عبارت آرائی و رنگیں بیانی کو اتنی اہمیت دی جاتی ہے کہ ادب آخر میں پہیلیاں بچھوانے لگتا ہے - چنانچہ 'بان بہت' کا کمال یہ ہے کہ الفاظ کو یوں ترکیب دیتا ہے کہ ایک ایک لفظ ۲۶-۲۶

سطروں تک پھیل جاتا ہے اور تشبیہ و استعارے کے بیان میں اتنی بلند پروازی کرتا ہے کہ مطالب چوستان بن کر رہ جاتے ہیں۔ ایک خاص صلف سخن 'بہر مرچھند' ہے جس کی مثال مہا بھارت اور سور داس وغیرہ کے ہندی کلام میں ملے گی۔ اب تک سخن سنجوں میں یہ بحث ہوتی ہے کہ ان سے شاعر کی مراد کیا ہے۔ غرض ایسے لفظی تکلفات سے وہ تمام شاعری بھری پڑی ہے اور ہونا بھی یہی چاہیے تھا۔ شاعر کے مشاہدات اور احساسات اسے آگے بڑھنے کی اجازت کیوں کر دیتے۔ ایک خاص بات یہ ہے کہ اس زمانے میں شاعر روح اور جسم میں کوئی امتیاز نہیں کوسکتا اور نہ دوئی کے پردے کو چاک کرنے کی سعی رائیگاں میں وقت گنواتا ہے۔ وہ اس زندگی اور اس کی لذتوں کے لیے زندہ ہے اور اسی وجہ سے 'بہر تھری' جیسے دو چار بیراگیوں کو چھوڑ کر حزن نیا تی رنگ کم ملے گا اور تصوف کا تو کوسوں پتا نہیں ہے!

'پلچ تلتر'، 'ہتھویدیش' اور 'مدرا راکشس' وغیرہ میں ہمارے لیے ایک جہان عبرت پنہاں ہے کیونکہ ان کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس عہد کے طبقہ امرا اور علمائے سو کا اخلاق کتنا پست اور انسانیت سوز تھا۔ مگر افسوس تو اس پر ہوتا ہے کہ شاعروں اور ادیبوں نے اپنے ذمے یہ خدمت لے لی تھی کہ ان بدعنوانیوں کو ایسی ساحرانہ رنگ آمیزی سے بیان کریں کہ دیکھنے والا نفرین کے بدلے آفرین کہے اور کف حسرت ملے کہ ہم ان مہنگلوں میں کیوں نہ شریک ہو سکے!

مسلمانوں کی فتوحات کے بعد ہندو سماج کی ذہنیت جس طرح بدلی اُس کے دو بون اثرات ہندی شاعری میں موجود ہیں۔ ایک تو رزمیہ اور جوشیلی نظموں کی مقبولیت۔ 'پرتھوی راج راسو'، 'ہمیر راسو

اور 'آلہا اور دل' وغیرہ اس زمانے کی نظمیں ہیں۔ بعد میں اورنگ زیب عالمگیر کے عہد حکومت میں جب ہندوؤں کے خنتہ جذبہ قومیت میں ہرجان پیدا ہوا تو شہواجی اور درگاداس جیسے سوراؤں کے ساتھ 'بھوشن' اور "رام داس جیسے شاعر بھی پیدا ہوئے جنہوں نے مسلمانوں کے خلاف ہندوؤں میں بڑا اشتعال پھیلایا۔ پچھلے دنوں جب اس ملک میں ہندو مسلم فساد کی آندھی املدی تھی تو یہ دونوں فرقہ پرست شاعر قبر میں کروت بدلیے لگے تھے۔

ہندو مذہبی پیشواؤں کے آگے یہ مسئلہ بھی پوش تھا کہ اسلام کے نرغے سے ہندو عوام کو کس طرح بچایا جائے جو برہمنوں اور پندتوں کی دست برد سے عاجز تھے۔ اس جدوجہد کا اظہار شاعری میں کبیر داس 'دادو دیال' اور تکارام وغیرہ بھکت شاعروں نے کیا۔ انہوں نے روزمرہ کی زبان میں سمجھایا کہ سارے فساد مذہبی دالوں کی وجہ سے شروع ہوتے ہیں اور بھگوان کی نظر میں سب انسان برابر ہیں۔ کبیر داس ہندوستانی جنتا (Masses) کا پہلا اور سب سے بڑا شاعر تھا جس نے امیروں اور پندتوں سے بے نیاز ہو کر عوام میں خودداری اور خود احساسی کے جذبات پیدا کرنے کی کامیاب کوشش کی۔ کیونکہ وہ اور اس نے معاصرین امیروں کی نہیں بلکہ غریبوں کی زبان میں گفتگو کرتے ہیں، اس لیے ان کا کلام ہر طرح کے اللے تللوں سے پاک ہے۔ یہ صحیح ہے کہ گوشہ نشین اور سادہ و منس ہونے کی وجہ سے یہ شعرا موت کو زندگی پر ترجیح دیتے اور لوگوں کو زندگی کی تگ و در سے الگ رکھتے اور جسمانی تفکرات سے بے پروا رکھتے کی نصیحت کرتے ہیں۔ چنانچہ کبیر داس ایک جگہ مارتن لوتھر سے ہمراہ ہو کر کہتا ہے کہ پرچا راجا بن جائے تو دنیا کا کام کیسے چلے گا؟

روحانی تسکین کے لیے وہ جسمانی تسکین کو ضروری نہیں سمجھتا —  
 عشقیہ شاعری کا عنصر ہندو ادب پر اب بھی اتنا ہی غالب ہے جتنا  
 عہد قدیم میں۔ بنگال میں 'چندی داس' بہار میں ودیا پتی اور برج بہاشا  
 میں بہاری 'دیو' متی رام وغیرہ ساج کی اس بے حرکتی اور بے حسی کے  
 نقاش ہیں جو مسلمانوں کے آنے اور یہاں جم جانے کے بعد پیدا ہو گئی  
 تھی۔ پھر بھی ان میں سے اکثر فطرت اور عوام کے قریب رہتے ہیں، اردو  
 شاعروں کی طرح نوابوں اور معشوقوں کے در پر نہیں پڑے دھتے، لہذا  
 ان کا عشق ایسا بیہودہ نہیں جیسا ان کے مسلمان متاخرین کا۔ تاہم  
 گوئی نصب العین اور مسلک نہ ہونے کی وجہ سے یہ لوگ بھی 'کرشن' اور  
 گوپیوں کے تذکرے سے آگے نہیں بڑھتے جس سے ان کا محدود زاویہ نگاہ  
 ظاہر ہوتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اگر 'کرشن جی' پیدا نہ ہوتے تو شاید قدیم  
 ہندی شاعری کا بڑا حصہ نہ لکھا جاتا۔ یہ ہندو طبقہ امرتا کی ذہنیت  
 کا اظہار ہے جسے بڑھاپے میں اپنے بچپن کے افسانے سننے میں لطف آتا  
 ہے۔ رام اور کرشن کی فتوحات میں یہ لوگ ظالموں کی شکست کا  
 خواب دیکھ رہے ہیں —

اردو ادب کے دور قدیم پر کچھ کہنے سے پہلے دو تین باتیں یاد  
 رکھنی ضروری ہیں۔ ایک یہ کہ اردو ادب کا پیہن منظر ایرانی ہے۔  
 عروض، بیان، معانی، تشبیہ و استعارات اور اساطیر ہی نہیں تقریباً  
 تمام اردو شعرا کی ذہنیت بھی غیر ملکی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی  
 ایرانی دس سال عرب میں رہنے کے بعد ہندوستان آیا اور یہاں کی زبان  
 میں شاعری کرنے لگا۔ وجہ ظاہر ہے۔ مسلمان حکموں طبقے اور عوام  
 کے مابین ایک سدسکندری قائم تھی۔ حضرات شعرا میں سے کم ایسے

ہوے ہیں جو دیہاتوں اور جنگل پہاڑوں کی سیر کرچکے ہوں۔ شہروں میں اور وہ بھی محبوب کی گلہوں اور نوابوں کے آستانوں میں ان کی عمریں گزر جاتی ہیں۔ 'درد' اور 'نظیر' جیسے شاعر کم ہوئے کہ جنہوں نے شاعری کو اپنا پیشہ نہ بنا لیا ہو۔ جب شاعری ایک جلس سنبھتہ لی جائے تو اُسے بازار کے خرید و فروخت کے اصولوں کے ماتحت رہنا پڑتا ہے اور چونکہ اس کے خریدار صرف دولت مند ہوتے ہیں لہذا ان کے ذوق و طبعیت کا پاس لازمی ہے ورنہ مہر تقی مہر کی سی حالت ہو جائے۔ اب درد جیسے صوفیوں کو دیکھیے کہ دنیا سے الگ رہتے اور نظم میں عبادت کرتے ہیں۔ مسکن ہے کہ حیات بعدالموت کے مسائل کے لیے اُن کی راہبانہ شاعری مفید ہو ورنہ جہاں تک اس زندگی اور اس کے ارتقا کا سوال ہے ' اس قسم کی شاعری 'کرم' اور 'قسمت' کے اصولوں کی طرح عوام کے لیے مضر اور جوش عمل کے حق میں نشہ آور ہے۔

اردو شاعری کا ایک بڑا حصہ قصائد پر مشتمل ہے جن پر کچھ کہنا لا حاصل ہے۔ قصیدہ خواں شاعر ایک ایسا مصاحب ہے جو مقبول تک بلندی کر لیتا ہے۔ غزل گوئی میں اظہار و ارداد کا دائرہ اتنا محدود رہ جاتا ہے اور قافیہ و ردیف کے ساتھ کیفیت کی یک رنگی کا وہ عالم ہوتا ہے جیسے کوئی مشون ایک رفتار سے ایک سی آواز کرتی چلی جا رہی ہے۔ اب ان متمول اور متوسط طبقوں کے ماحول کو دیکھیے جس میں لوگ روز ایک ہی طرح کے کام کرتے ہیں۔ ان کے مشاغل اور دلچسپیوں میں کبھی فرق نہیں آتا تھا۔ آمد و رفت کے ذرائع کم ہونے کی وجہ سے سفر کی نوبت بھی کم آتی تھی۔ نہ اخبارات شائع ہوتے تھے اور نہ خطوط آسانی سے آجاسکتے تھے تاکہ باہر کے حالات معلوم ہو سکیں۔ اُس بے رنگ و بو

زندگی کی جھلک غزل کی مقبولیت کی صورت میں نمایاں ہوئی۔ معشوق سے ہم کلام ہونا — یہ دوسری بات ہے کہ وہ عرش آشیان تھا یا فرشِ نشہیں — اردو شاعر کا سب سے اہم فریضہ تھا! بجز مثلوی اور مرثیے کے دوسرے اصنافِ سخن کی زبوں حالی اس طبقے کی کم نگہی اور متعدد خیالی کی دلیل اور اس بات کا ثبوت ہے کہ اس زمانے کی اردو شاعری امیروں کی تفریح کے سوا کوئی کام انجام نہ دے سکی۔ اس میں دو رجحانات زیادہ واضح ہیں۔ ایک تو 'معشوق حقیقی' سے خطاب اور جسم کی قید سے آزادی کے لیے روح کی بے کلی۔ یہ صوفیوں کی ترجمانی ہے جو نام نہاد مسلمان امرا کی عیش کوشی اور منافقت سے تلگ آکو دنیا سے بیزار ہو گئے اور ایک جہان نوکی طرح ڈالنے لگے۔ غربت اور افلاس کی وجہ سے جن شاعروں کی پہنچ محفلِ جازاں میں نہ ہو سکتی تھی، انہیں بھی اچھا بہانہ ہاتھ آیا اور وہ جمال باری نے آئیے میں جلوہ یار دیکھنے لگے!

فتحِ ہند کے بعد ہی مسلمان امرا اور علما میں تنازع شروع ہو گیا تھا۔ مذہبی جماعتِ امور سلطنت میں دست اندازی کی متواتر کوشش کرتی رہی جس میں اسے سخت ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ مولویوں نے رئیسوں کو احتساب کی تلتھیں کی بلکہ کئی مرتبہ سے خانوں پر پہرے بھی لگادیے، جس کی وجہ سے عیش پسند اور رند مشرب ان سے سخت ناراض رہنے لگے۔ چنانچہ فارسی اور اردو شاعری میں عام طور پر مستحسب، زاہد اور شہخ کی جس بری طرح خبر لی گئی ہے شاید بولاشہوک شاعروں نے سرمایہ دار معشوقوں کو بھی اتنا نکو نہ بڈایا ہوگا۔ دراصل یہ اس ماحول کی رند روشی اور احتساب و شریعت کی پابندی سے بیزاری کا اظہار ہے۔ تاریخ شاہن ہے کہ عہد وسطیٰ میں عموماً اور اورنگ زیب کے بعد خصوصاً

مسلمانوں کے زوال کے ساتھ سماج میں ایسی ابتری پھیل گئی جس کی مثال نہیں ملتی۔ دلی اجڑنے لگی اور لکھنؤ کی چمن بندی شروع ہوئی۔ نادر شاہ ابدالی اور مرہٹوں کے حملوں نے دلی کو جھساخستہ و خراب کیا اس کا اضمحلالی اثر میر درد اور دلی اسکول کے دوسرے شاعروں پر کم و بیش نمایاں ہے۔ لکھنؤ کی خوشحالی اور خوش باشی کا اثر وہاں کے شاعروں پر جیسا کچھ پڑا اس کے آئینہ دار 'امانت'، 'رشک'، 'زند' اور جان صاحب وغیرہ ہیں۔ 'آتش' ان سے کسی قدر الگ ہے کیونکہ دوسرے لکھنوی شاعروں سے اس کی زندگی مختلف ہے۔

تمام ہندوستانی شعرا زندگی سے کٹنے بے خبر اور بے پروا تھے، ان کے جذبات کٹنے اوجھ اور احساسات کٹنے بے حقیقت تھے، اس کا اندازہ لگانے کے لیے چشم عبرت کی ضرورت ہے۔ پلاسی کی لڑائی ٹکڑا ہوا قومی سانحہ تھا، پانی پت کی تیسری لڑائی ہندو طاقت کے لیے پیام موت تھی، تیبو سلطان کی شکست مسلمانوں اور ہندوستانیوں کے تفلز کا اعلان تھا۔ اور ان سب سے اہم سنہ ۷۷ ع کا سانحہ تو ہندوستانی سماج کی بربادی کا پیش خیمہ تھا۔ کتنے شاعروں نے ان خونچکاں واقعات کو نظم کیا؟ کتنے نوحے لکھے گئے؟ کہاں تھے وہ رجز گو مرتبہ خواں جن کی جادو بیانی سے محترم کی ہر محفل ماتم کدہ بن جاتی تھی؟ کسی بڑے شاعر نے پلاسی کی لڑائی پر ایک نوحہ نہ لکھا۔ واقعہ سنہ ۵۷ ع پر داغ کا شہر آشوب اور غالب کے خطوط پڑھیے اور سر پیت لیجھیے کہ جب یورے ملک کی قسمت

\* گذشتہ صدی کے آخر میں جب بنگالیوں میں قومیت کا احساس پیدا ہونے لگا تو اس سانحے پر ان کے شیعریں مقال شاعر، نوین چندر سین نے ایک ولولہ انگیز نظم بعنوان "پلاسیر یودہ" لکھی۔ اسی طرح اس موضوع پر بنگال کے مشہور شاعر نذر الاسلام نے بھی ایک نظم تلم بند کی ہے واقعہ سنہ ۵۷ ع پر شہر شکوہ آبادی کے کچھ کلام اور شاہ ظفر کی کچھ غزلوں کو مستثنیٰ سمجھنا چاہئے۔

کا فیصلہ ہو رہا تھا، یہ حضرات اپنی روٹیوں کے سوا کچھ نہ سوچ سکتے تھے اور سوچتے تھے تو ایسے بزدل نہ اور رجعت پرورانہ طریقوں سے جو زندگی اور شاعری کے لیے باعث ننگ ہیں —

اس ادب کی مثال امریہل سے دی جاسکتی ہے جو اسی درخت کو فنا کرتی ہے، جس پر پرورش پاتی ہے - کیونکہ عہد قدیم کے تمام شاعر پیشہ ورتے اور نوابوں اور راجاؤں کے ملت کش تھے لہذا امیہروں کے مفاد سے اُن کا اثر پزیر ہونا لازمی تھا - اُن کی خوشبودی کے لیے اُن کی زبان میں بولغا بھی ضروری تھا اور بعد میں تو زبان دانوں کے معرکے بتیہروں کی پالی کی طرح عام ہو گئے - اردو زبان میں ہال کی کھال جس طرح نکالی گئی شاید اس کی مثال دنیا میں اور کہیں نہ ملے گی - معنی پر زبان کو ترجیح دینا، اس طبقے اور اس کے لگے لپٹوں کے جھوٹے نظریۂ زندگی کا ثبوت ہے جو نظام زندگی پر سانپ کی کیلچلی کی طرح چھائے ہوئے تھے - اس صورت حال کو دیکھ کر طالسٹائی کے اس خیال سے اتفاق کرنا پوتا ہے کہ ”ہمارے سماج میں لوگ اکثر کہا کرتے ہیں کہ اگر کوئی آرتست فکر معاش سے آزاد ہو جائے تو زیادہ بہتر کام کر سکتا ہے - یہ خیال مہرے اس دعوے کی پرزور تائید کرتا ہے کہ ہم جس چیز کو آرت سمجھتے ہیں وہ ہرگز آرت نہیں بلکہ اس کی پرچھائیں ہے! آرت اور صنعت میں بڑا فرق ہے - آرت فن کار کے ہیجانوں کو دوسروں تک منتقل کرنے کا ایک ذریعہ ہے - ہیجان اسی آدمی میں پیدا ہو گا جو ایک معمولی انسان کی طرح اپنی فطری زندگی کے ہر پہلو کو نشوونما حاصل کرنے کا موقع دیتا ہے - اگر فن کاروں کو مہلت کی روٹیاں ملیں تو ان کی تخلیقی قوت برباد ہو جائے گی - کیونکہ پھر قدرت اور سماج سے خود حفاظتی کے لیے وہ کیسے لڑیں گے

اور ان معائب کو کیوں کر سمجھیں گے جن سے فکر معاش میں ہر فرد بشر کو دوچار ہونا پڑتا ہے۔ اس طرح وہ سب سے اہم ہیجانوں سے محروم رہ جاتے ہیں جو ہر آدمی میں کم و بیش موجود ہیں اور انفرادیت کے ارتقاء کے لئے ناگزیر ہیں۔ آج ہمارے سماج میں آرتھسٹ جس عیش و اطمینان کی زندگی بسر کرتا ہے، اس سے زیادہ مضر ماحول کسی فنی تخیل کے لئے ہو نہیں سکتا۔

اردو شاعروں میں درد، اور 'نظیر' جیسے معدودے چند لوگوں کو چھوڑ کر باقی سب لوگ وظیفہ خوار تھے۔ 'درد' دنیا سے بیگانہ اور 'میر' اپنی ناکامیوں کی وجہ سے زندگی سے بیزار! اس لحاظ سے دونوں زندگی کے اہم ضروری جذبات کے اظہار سے اجتناب برتتے ہیں۔ افسردگی، رہبانیت اور حزنیت کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے، بد نصیبی اور ناکامی کے گلے ہیں، حسرت و یاس کے افسانے ہیں۔ زندگی کی کش مکش سے الگ رہنے اور فطرت سے محظوظ نہ ہو سکنے کی وجہ سے ان حضرات کو برائیوں کے سوا کہیں کچھ نہیں دکھائی دیتا۔ چونکہ میں اظہار جذبات کو جذبات پر ترجیح نہیں دیتا، اس لئے پہلے یہ دیکھتا ہوں کہ شاعر کہتا کیا ہے، کیسے کہتا ہے کا سوال بعد میں آتا ہے۔ 'نظیر' کے یہاں حسن بیان کی کمی اور عامانہ جذبات کی زیادتی ضرور ہے جس کی وجہ سے اس کی آواز اور خانہ بدوش زندگی ہے۔ لیکن پورے اردو ادب میں وہی ایک ایسا شاعر ہے جو عوام کے ساتھ رہتا، انہیں سمجھتا اور ان کے تاثرات کو انہیں کی زبان میں بیان کرتا ہے۔ اس زمانے کی زندگی کا معیار اتنا جاہلانہ تھا کہ ادیب سے زیادہ توقع نہیں کی جاسکتی۔ اگر وہ اپنے زمانے کی صحیح تصویر پیش کر دے اور ساتھ ہی قلب میں جذبہ درد ملدی رکھتا ہو تو

بہت ہے۔ اس لحاظ سے نظیر تلسی داس اور کبیر داس سے پیچھے ہے۔ تاہم وہ ایک عام شہری کی نظر سے دنیا کو دیکھتا اور اپنے آئینہ زندگی میں وہ تمام خرابیاں دکھاتا ہے جو اسے نظر آتی ہیں۔ طور اور نجد کے تذکرے اُس کے کلام میں ناپید ہیں۔ وہ بوزھوں، مغریوں اور فقہروں کے ساتھ رہتا اور انہیں قوت گویائی بخشتا ہے۔ افسوس کہ نظیر محنت کش نہ تھا ورنہ اس کا زاویہ نگاہ بلند ہوتا۔ اپنی تمام برائیوں کے باوجود ہندوستان کے ادب قدیم میں اسے ایک خاص مرتبہ حاصل ہے۔ کبیر عوام کا مصلح ہے تو نظیر ان کا یار غار ہے۔ کاش یہ دونوں فقیر نہ ہوتے!

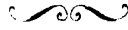
• چند صفحات میں ہزاروں سال کے ادب کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا۔ ہم نے اپنے تجزیہ کے مطابق یہ اصول قائم کیا تھا کہ ادب جذبات کا اظہار ہے اور جذبات ماحول سے متاثر ہوتے ہیں۔ اچھے جذبات اچھے ماحول کے محتاج ہیں۔ پھر یہ بھی دیکھا کہ زندگی ارتقا بالصدق کے ذیلوں سے شاہراہ ترقی پر گامزن ہے اور ادب اس وقت تک زندگی کا آئینہ دار نہیں ہو سکتا جب تک اس کا ہمدوش نہ ہو۔ ادیب کا فرض ہے کہ ماضی کے عیوب سے حال کو باخبر کرے اور حال کی تصویریں کھینچے کہ اس میں مستقبل کے لیے اشارات پنہاں ہوں۔ جب ہم نے اس روشنی میں ہندوستانی ادب کو دیکھا تو مایوسی اور شرمساری کے ساتھ ہم گور کی سے ہم آہنگ ہو کر چہنچ اٹھے کہ ”ماضی کے بت کو پوچھنے والے شاعر و حال کی برائیوں کو چھپانے والے ادیب اور مستقبل پر تاریکی کا پردہ ڈالنے والے افسانہ نگار و مت جاؤ ورنہ تاریخ تمہیں متادے گی!“

اردو شاعری کے عیوب کے لیے کئی اسباب ذمہ دار تھے۔ ایک یہ کہ وہ اس زمانے میں پھولی پھولی جو مسلمانوں کی حکومت اور سامنتی تمدن

کے زوال کا دور تھا۔ جس طبقے نے اسے گود لیا وہ خود قعر مذلت میں  
 پڑا ہوا تہزی سے بربادی کی طرف چلا جا رہا تھا۔ پھر اس کی تربیت ایسے  
 ہاتھوں سے ہوئی جنہوں نے نان بانٹی کی دکان کی طرح اسے اپنی روٹی  
 کمانے کا وسیلہ بدلا لیا۔ یہ تو تھا ہی ساتھ ساتھ ایک تلگ نظر سوسائٹی  
 میں پرورش پا کر اس نے اپنے لیے عرصہ حیات تلگ کر لیا۔ سماج کے دباؤ  
 اور اپنی کوتاہ بھلی کی وجہ سے شاعر بہت کم موضوعات پر لکھ سکتا تھا۔  
 ادب کا پودا آزادی کی ہوا میں ہی پروان چڑھے گا۔ پھر یہ بھی ہے کہ  
 پودے کی بھیجا سختی اور جلسی تشدد کی وجہ سے گلوے تغزل میں پھانسی  
 کا پھلدا سا پڑ گیا۔ اردو شاعری کی معشوقہ — اگر ایسی کوئی چیز ہے تو —  
 ایک ہرجائی طوائف ہے اور سوچئے کہ اس سے کسی قسم کا لگاؤ شاعری  
 کی نازک روح پہ کس قدر گراں ثابت ہو گا —

اس تجزیہ سے کسی کی تلقیص یا تضحیک مقصود نہیں۔ اس بحث کا  
 ماحصل صرف یہ ہے کہ زندگی کی حفاظت اور ترقی کا مسئلہ سب سے زیادہ  
 اہم ہے اور کسی چیز کو اس پر فوقیت اور برتری نہیں دی جا سکتی۔ ادب  
 زندگی سے عبارت ہے نہ کہ زندگی ادب سے۔ ادب کے نام پر جو چیز انسان کو  
 زندگی سے بھزار ہونے کی تعلیم دیتی ہے انسان کو فوراً اس سے بھزار ہو جانا  
 چاہیے۔ سچ پوچھا جائے تو اس دور کے تقریباً تمام آرٹسٹ صناع ہوئے ہیں۔  
 اس وقت تک صحیح معنوں میں آرٹ کا ارتقا ہوا ہی نہیں۔ کالہداس،  
 کبیر، نظیر اور غالب وغیرہ کے سوا شاید کوئی ایسا شاعر نہیں جسے مستقبل  
 کا انسان عزت سے یاد کرے گا —

## ہندوستانی ادب کے دور جدید کا معاشی تجزیہ



ہندوستانی ادب کے دور جدید پر ہم زیادہ تفصیلی نظر ڈالیں گے کیونکہ اس کا براہ راست ہماری نسل سے تعلق ہے اور اس کی ترکیب و تدوین ہمارے ہاتھوں ہو رہی ہے۔

اشاروں اشاروں میں پہلے ہم یہ دکھلا چکے ہیں کہ سماج کی بنیاد افراد کے اقتصادی تعلقات پر منحصر ہے اور ان کے رشتہ مادی کے اعتبار ہی سے کسی دور کی ذہنی و روحانی تحریکات کو سمجھا جا سکتا ہے۔ علاوہ بریں، ادب اب تک تعلیم یافتہ طبقے کا اجارہ رہا ہے اور اس کی گہرائیوں تک پہنچنے کے لیے اس طبقے کے رجحانات کو پہچاننا بے حد ضروری ہے۔ سچ پوچھو تو ہمارے ادب کے سرچشمہ سے جو نئی نئی نہریں کٹ رہی ہیں وہ دراصل متوسط طبقے کی حالت کا پتہ دیتی اور اس ذہنی رد عمل کو ظاہر کرتی ہیں جو ایک طرف تو حرفتی اور سامنتی تمدن کی کش مکش اور دوسری طرف ہندوستانی قومیت یعنی دیسی حرمت اور غیر ملکی ملوکیت کے تصادم کی وجہ سے ان میں پیدا ہو گئی ہے۔

سنہ ۱۸۵۷ کے بعد انیسویں صدی کے اواخر تک ہندوستانیوں کی

ذہانت میں سرعت سے ایک انقلاب ہوتا رہا کیونکہ انسان جب اپنے مادی

حالات میں رد و بدل کے لیے مجبور ہوتا ہے تو ان کے قبول کرنے کے لیے تاویاں بھی پیدا کر لیتا ہے۔ مسلمان حکمران طبقہ جو ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت سے برسر پیکار رہ کر انحطاط پذیر ہو چکا تھا اب اس کی پذیرائی کے لیے مجبور ہوا۔ چنانچہ علی گڑھ تحریک در حقیقت نئی تہذیب کی فتح کا اعتراف تھی۔ پچاس سال پہلے راجہ رام موہن رائے نے بلکال میں جو تحریک شروع کی تھی سرسید نے اب اس کی تجدید مسلمانوں میں کی اور دونوں کا رد عمل قومی زندگی پر تقریباً ایک سا ہوا۔ جب نئی تہذیب کے نشے میں سرشار ہو کر ایک دو نسلیں بلکال میں نکل چکیں تو وہاں کے اکابر کو یکایک محسوس ہوا کہ انگریزی زبان ان کی زندگی میں ناسور ڈال رہی ہے، درآن حالیکہ ناسور پہلے سے موجود تھا جسے یہ مغربی نشتر اب ابھار کر دکھا رہا تھا۔ سرکاری نوکریوں میں فرقہ وارانہ تمیز کی وجہ سے آہستہ آہستہ ہندو مسلم کی تفریق بڑھتی گئی۔ ادھر زندگی کے نئے نظریوں نے قدامت کا قلع قمع شروع کیا اور ضرورت ہوئی کہ پرانی شراب نئی بوتلوں میں ڈھالی جائے اور اس پر جدت کی چٹیں چپکائی جائیں۔ فرقہ وارانہ تفریق کا یہ لازمی نتیجہ تھا کہ دونوں قومیں اپنی برتری ثابت کرنے کے لیے اپنی اپنی معاشرت اور تاریخ کے تاریک پہلو کو چھپائیں، اپنے ماضی کو بڑھا چڑھا کر دکھائیں اور ساتھ ساتھ نئی روشنی کے حملوں سے بچنے کے لیے جدید کو اپنے مشق ستم کا ہدف اور 'قدیم' کو تمام خوبیوں کا منبع ثابت کریں۔

چپکن اور گھٹلے کے ساتھ مسلمان متوسط طبقے نے طلسم ہو شربا اور اندر سبھا کا بانا بھی چھوڑا اور نئے خیالات کے اظہار کے لیے نئے پیراے نکالے۔ انگریزی تعلیم کی مقبولیت نے ان کے آگے قدرت کے نئے مناظر پیش

کئے اور سماج کے ساتھ ادب کو بھی پابندیوں سے آزاد کرنے کی کوشش ہونے لگی۔ نظام حکومت کی تبدیلی نے اس طبقے کو مجبور کر دیا کہ تحفظ حیات کے لیے اپنی ذہنیت کو مادی ضروریات کے لحاظ سے بدلے اور پھر تو اسے یکا یک معلوم ہونا بھی چاہئے تھا کہ مذہب کا وہ تصور غلط ہے جو اسے حرفتی تمدن کے ساتھ چلنے سے روکتا ہے۔ زندہ رہنے کے لیے قبل از گذر کی روحانی اور داخلی (Subjective) فضا سے نکل کر واقعیاتی نقطہ نگاہ پر آنا ضروری تھا اور اب ادب و زندگی میں بے ربطی اس طبقے کے لئے مضرت رساں تھی۔ قعر مدلت میں پڑے ہوئے مسلمانوں کے جگانے کے لیے بیانیہ اور خطیبانہ انداز اختیار کرنا ضروری تھا۔ نظم کا عروج اور غزل کا زوال خود فریبی پر خود تلقیدی تصور پر عقل اور پابندی پر آزادی کی فتح یابی کا ثبوت ہے۔ نئے جذبات اپنے لیے نئے اصناف تلاش کر لیتے ہیں۔ ادھر بلگال میں ٹیگور نے پیش پا افتادہ اور پامال بحروں کو چھوڑ کر اپنے لیے ایک نئی طرز کی طرح ڈالی۔ اس کاوش میں اسے عہد وسطیٰ کے ویشنو شاعروں سے بڑی مدد ملی جو سماج کی پابندیوں کے ساتھ سنسکرت چہندوں کی قید سے بھی آزاد تھے اور اپنی تیز رفتاری کے لیے نئی راہیں تلاش کرتے تھے۔ ہندی پر ان دو تحریریکوں کا گہرا اثر ہوا اور برج بھاشا کو چھوڑ کر لوگوں نے کھڑی بولی کو اپنایا جو میرے خیال میں سنسکرت آمیز اردو ہے۔ اسی طرح گجراتی اور مرہٹی میں بھی شاعری نے نیا رنگ روپ اختیار کیا۔ غرض زندگی کے ساتھ شاعری کا ظاہر بھی بدلا۔ اب یہ دیکھیے کہ زندگی کی مختلف النوع تبدیلیوں کے ساتھ ادب کے موضوعات اور رجحانات بھی کیسے بدل رہے ہیں۔

سرمشار، اور مولوی نذیر احمد کے ناول سامعنی تمدن کی دستی کے

دور کا نقشہ کھینچتے ہیں جو اب اتنی نمایاں تھی کہ چشم پوشی سے کام نہ چل سکتا تھا۔ یہ دونوں حضرات لکھنؤ اور دلی کی زندگی سے خوب آشنا تھے اور ظاہر ہے کہ یہ دونوں شہر مسلمان حکمران طبقے کے نقش آخر اور اب ان کے انتہائی تلزل کے آثار تھے۔ سجاد حسین کا اخبار ایک چھوٹے پیمانے پر وہی کر رہا تھا جو 'مولیر نے فرانس میں اور 'سرورنٹس' نے اسپین میں صدہا سال پہلے کیا تھا۔ یہ دونوں ساملتی تمدن کے دور انحطاط میں پیدا ہوتے اور اپنے طنز کے تیروں سے اس کی زندگی دوہر کر دیتے ہیں۔ سجاد حسین اور سرشار نے اپنی بساط کے مطابق یہی کیا۔ ادھر ہندوؤں اور مسلمانوں کی تفریق نے ان میں فرقہ پرستی کے بیج بودیئے اور اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ ادب پر مردہ پرستی کی مہر لگ جائے اور دونوں قوموں کے اہل قلم ایک دوسرے پر چشمک زنی شروع کریں۔ ادب کی زندگی کا نیا دور انگریزی زبان کی رومانی تحریک سے متاثر تھا اور اس جذبہ قومیت کے اظہار کے لیے رومانی ناول سب سے زیادہ مناسب تھے۔ چنانچہ بلکال میں 'بلکم چندر' اردو میں مولانا شرر اور مرہٹی میں آپتے نے ناول نگاری کو نئے طریقے سے چمکایا۔ بلکال میں انگریزوں کے خلاف نسلی تعصب کے جذبات پھیل رہے تھے اور اس طرح بلکم چندر کے ناولوں میں مسلمانوں کے ساتھ انگریزوں کے مظالم کی بھی داستان ہم پڑھتے ہیں۔ تعجب کا مقام ہے کہ اس زمانے کا یہ سرکاری عہدہ دار اور خطاب یافتہ مصلف دل میں وہ ولولہ قومی رکھتا تھا کہ اس کا ایک ناول 'آند متھ' بلکال میں نراج (Anarchism) کا محرک اور اس کا گیت بڈے ماترم قومی تحریک کا ترانہ بن گیا۔ 'شرر' اسلامی فتوحات کا قصہ گو ہے لیکن بلکم چندر کی تحریروں سے بیچ و تاب

کہا کر 'مذکور موہنا' جیسے ناولوں میں اپنے معاصر کی 'چانچل کناری' کا جواب دیتا ہے۔ شکر ہے کہ ادب کے سر سے یہ آسپب جلد اتر گیا اور بعد میں صرف اخباری نظموں اور 'افسانہ' کے نام سے منسوب کی جانے والی چیزوں میں اس کا اثر باقی رہ گیا۔

حالی کی مسدس نے شاعری میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا اور ان کے ہم عصر اردو اور ہندی کے شاعروں نے اس قسم کی شاعری کو خہالات کی نبلیف کے لیے بہت موزوں سمجھا۔ موجودہ دور کے ہندی شاعروں میں 'بابو میتھلی شرن گپتا' کا رتبہ بہت بلند ہے۔ مسدس سے متاثر ہو کر انہوں نے 'بھارت بھارتی' نامی نظم لکھی جو ہندی میں بے حد مقبول ہوئی۔ موضوع دونوں کا ایک ہے، دونوں کا رنامہ اسلاف سنا کر زمانہ حال کی زبوں حالی کی تصویر کھینچتے اور اپنی اپنی قوم کو پیام عمل سناتے ہیں۔ مسدس جس کی نقالی ہندی اور اردو دونوں زبانوں میں کی گئی، ادبی انقلاب اور قومی بیداری کی خبر دیتی ہے۔ اس کے چند سال بعد ہی انڈین نیشنل کانگریس وجود میں آتی ہے اور کچھ عرصے بعد بنگال سودیشی تحریک شروع ہوتی ہے۔ یہ قومی اور سیاسی تحریکیں بیداری کے آثار ہیں۔ ان کے محرک اور موید ایک تو وہ لوگ تھے جو سیاسیات اور حکومت میں شرکت کے طالب تھے یا وہ لوگ جو قومی حقوق یعنی دیسی صنعت و حرفت کی توسیع کا مطالبہ کر رہے تھے۔ ہندوؤں میں عموماً اور بنگال میں خصوصاً قومی خودداری کا احساس بڑھتا جاتا تھا اور سیاسی بیداری کے ساتھ ادب میں بھی جوش و ولولہ کے اثرات پیدا ہونے لگے تھے۔ گذشتہ صدی کے اواخر میں جب نھل کی کاشت کے انگریز اجارہ داروں کے مظالم حد سے تجاوز کر چکے تو ایک

بنگالی مصنف کا ڈراما موسومہ ' نیل درپن ' ہی تھا جس نے ملک کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک احتجاج کا علم بلند کر دیا اور بالآخر حکومت کو ان شایتموں کو دفع کرنا پڑا - ' نوین چندر سہن ' نے پلاشیدر جدہ ( پلاسی کی لڑائی ) کے عنوان سے ایک عظیم الغظیر رزمیہ نظم لکھ کر بنگال کو اس خون چکان واقعے کے یاد دلائی اور مشہور ڈراماگست دی - ایل - راے نے کئی قومی گیت لکھے جو آج بھی بنگال کے بچے بچے کی زبان پر ہیں -

نئی روشنی اور پرانی روشنی کا تنازع در اصل ہندوستانی سماج کی اس کش مکش کو ظاہر کرتا ہے جو مشینوں کے عروج اور دست کاری کے زوال کی وجہ سے پیدا ہو گئی تھی - ہمارے تعلقات کی نوعیت بدل رہی تھی جس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ نظریۂ زندگی بھی بدل جائے - یہ ایک نفسیاتی نکتہ ہے کہ مستقبل کی تاریکی انسان میں ماضی کی پرستش کا جذبہ پیدا کر دیتی ہے چاہے وہ بذات خود کتنا ہی تلخ کیوں نہ ہو - جس طرح بوڑھا عہد پیری میں اپنے بچپن کو یاد کرتا ہے درآن حالیکہ یہ یاد بے سود ہے اسی طرح جب کوئی تہذیب غارت ہوتی ہے تو اس کے نام لیوا زمانۂ قدیم کی مدح سرائی کی صورت میں اپنی شکست کا اعتراف کرتے ہیں - روس میں ساملتی دور کے انحطاط اور سرمایہ داری کی اُٹھان کے ساتھ ' طالسٹائی ' پیدا ہوتا ہے ' انگلستان میں ' رسکن ' اور ' کارلائیل ' مشینوں کے خلات آواز بلند کرتے ہیں ' فرانس میں ' روسو ' رجعت قہقری کی حمایت کرتا ہے - اس دور کے ہندوستانی ادیبوں میں بھی بڑی حد تک یہ ذہنیت کام کر رہی ہے - چونکہ ہندو اور اسلامی تمدنوں کا امتیاز متوسط طبقے میں رہتا آیا ہے اور یہی لوگ ہندو قومی زندگی کے نگہبان اور علم و ادب کے پاسباں رہے ہیں ' اس لیے اپنی اپنی

روایتوں کے لحاظ سے یہ اس جذبہ شکست کا اظہار کرتے ہیں - 'طالسٹائی' جس قسم کے نراج کی تبلیغ کرتا ہے وہ ہندو تمدن کے عہد زریں کی تصویر ہے - عدم تشدد، دہانیت، مشینوں کا ناس اور اس قسم کی چیزیں ہندو تمدن کے عناصر میں سے ہیں اور ان کے لئے قابل قبول ہیں - اسی وجہ سے 'طالسٹائی' کے اصول، 'ٹیکور' کے ادب اور 'گاندھی جی' کی تحریکوں پر ایک گہرا نقش چھوڑ گئے ہیں، حالانکہ میرے خیال میں 'ٹیکور' اس روسی ادیب سے قریب تر ہے - مسلمان ادبا بھی دورِ حرفت اور مشینوں سے منحرف ہیں لیکن ان کی برائیوں کا حل وہ اسلامی روایتوں کے مطابق تلاش کرتے ہیں - تاہم دورِ حرفت اور سائنس سے کلیتاً بغاوت اور ماضی کی پرستش اس دور کے ادب کی بڑی خصوصیتیں ہیں - 'اکبر الہ آبادی'، 'اقبال' اور 'ٹیکور' جابجا مغربیت کے خلاف مشرقی معاشرت کی طرف سے صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں - خصوصاً 'اکبر' کو ہر پرانی چیز اچھی اور ہر نئی چیز بری معلوم ہوتی ہے - لیکن چونکہ وہ کوئی مفکر نہیں اس لئے اپنے باقی دونوں معاصروں کی طرح موجودہ مسائل کا کوئی حل پیش نہیں کر سکتا -

ادب ہند کے موجودہ رجحانات کو سمجھنے کے لیے سرسری طور پر یہ دیکھ لینا چاہئے کہ انیسویں صدی کے اواخر سے ملک میں کیسی کیسی تحریکیں ہلتی اور بگرتی رہی ہیں -

دیسی سرمایہ داروں کی تحریک بلکال کی سودیشی تحریک سے شروع ہو کر سنہ ۲۰-۲۲ ع کے عدم تعاون میں اپنے حدِ عروج کو پہنچتی اور پھر رفتہ رفتہ کم زور ہونے لگتی ہے اور گزشتہ تحریکوں کے بعد پر شکستہ ہو جاتی ہے - قومی تحریکوں کی وسعت کے ساتھ ہندو مسلم اتحاد کا صور پھونکا

جاتا ہے اور ہندی اور اردو کو ملانے کی کوشش ہونے لگتی ہے - عربی فارسی اور سنسکرت کے الفاظ کا استعمال کم کرنے کی سعی بھی کی جاتی ہے اور ہندی میں اردو اور اردو میں ہندی الفاظ مقبول ہونے لگتے ہیں - مسلمان متوسط طبقے پر چونکہ حجاز و شیراز کا رنگ چڑھا رہا ہے لہذا ان کی تہذیب میں بھی غیر ملکی عنصر پایا جاتا ہے - یہ ایک عجیب بات ہے کہ وطن پرستی کے نقطہ نظر سے اردو نے جو سب سے بڑا شاعر پیدا کیا وہ کوئی مسلمان نہیں بلکہ ایک ہندو یعنی 'برج نارائن چکبست' آنجہانی تھے - ہندو متوسط طبقہ ان تحریکوں میں پیش پیش رہا ہے اور اسی لیے اس کا ادب زیادہ قوم پرورانہ ہوتا جاتا ہے - ادھر قبل از جنگ اور دوران جنگ کی پان اسلامی تحریکیں اور سنہ ۲۱ - ۲۰ ع کی تحریک خلافت سے اردو شاعری بے حد متاثر ہوتی ہے اور 'اقبال' کی سرکردگی میں اسلامی قومیت کے سپاہی اردو ادب پر چڑھ آتے ہیں - باایں ہمہ مسلمان نوجوانوں کا ایک طبقہ ملکی تحریکوں کا ہمدرد اور موئید ہے اور 'جوش ملیح آبادی' سیماب اکبر آبادی، اور 'ساغر نظامی' وغیرہ ان جذبات سے متاثر ہوئے ہیں - عدم تعاون کی ناکاہابی کے بعد ملک میں کئی سال تک جمود کی سی کیفیت رہتی ہے - نوجوانوں کا ایک طبقہ مستقبل سے ہراساں ہو کر یا تو انگریزوں پر ہم پھیلنا چاہتا ہے یا طرب و نشاط میں اپنی کلنتوں کو بھول جانا چاہتا ہے - اس دور کی بعض ہلکامی تصنیہیں اور اردو اور ہندی شاعری کی رومانی تحریکیں اس جذبہ شکست کو ظاہر کرتی ہیں - گاندھی جی کے عدم تشدد اور انقلاب پروروں کے نظریۂ تشدد میں تصادم ہو رہا ہے جس کا عکس ہم ایک طرف کٹھاری کے مشہور شاعر 'اناکولا' اور گجرات کے سحر طراز قومی

شاعر 'ارد شیر خبردار' کی ستیاگرہی نظموں اور دوسری طرف شاعر انقلاب 'قاضی نذرا لاسلام' کے ہنگامہ پرور کلام میں دیکھ سکتے ہیں -

سنہ ۲۵ ع کے بعد سے عوام کی خنکے روح بھی جاگ رہی ہے اور مزدوروں اور کسانوں نے سیاسی جدوجہد میں حصہ لینا شروع کر دیا ہے - متوسط طبقے کے کچھ لوگ ان کے حقوق اور مطالبات کی تائید کر رہے ہیں اور اسی طرح دور جدید کے ادب میں صرت یہی نہیں کہ ان کی حالت کیا ہے بلکہ کہیں کہیں یہ بھی دکھانے کی کوشش کی جا رہی ہے کہ انہیں کیا کرنا چاہیے - 'پلذت دیوندر ستھارتھی' نے بہت بڑے پیمانے پر دیہاتی گیتوں کو جمع کرنے کا کام شروع کر رکھا ہے - ادھر 'تھگور' 'شرت چندر چتر جی' اور 'پریم چند' ان برائیوں کا حل 'اصلاح' کو سمجھتے ہیں اور سرمایہ داروں اور زمینداروں سے رحم و کرم کی توقع رکھتے ہیں تاکہ وہ کسانوں اور مزدوروں کے ساتھ ایک ہی گھاٹ پانی پی سکیں - کچھ عرصے سے اشتراکیت اور انقلاب کی تعریکوں کی مقبولیت اور اصلاحی جدوجہد کی ناکامی نے ہر زبان میں ایسے ادیب پیدا کر دیے ہیں جو نظام معاشی کی صحت کے لیے سرمایہ داری کی تباہی کو ضروری سمجھتے ہیں - اس ضمن میں ہم مرہٹی کی چند لوک (چاند کی دنیا) اور بنگلہ کی 'شرمک گان' (مزدوروں کا گیت مصلحتہ ملصور احمد) کے نام لے سکتے ہیں -

بہر حال یہ تو ظاہر ہے کہ دور جدید کا ادب بڑی حد تک زندگی کا ترجمان ہے اور غزل جیسی داخلی صنف کا زوال اور نظم جیسی واقعاتی صنف کی مقبولیت اس بات کی دلیل ہے کہ اردو کا ادیب جذبات و خیالات میں ارتباط قائم رکھنا اور ادب کے ذریعے زندگی کی خدمت کرنا چاہتا ہے - اب دیکھنا یہ ہے کہ ادب کے یہ نئے رجحانات زندگی کو منزل

مقصد کی طرف لے جا رہے ہوں یا نہیں اور اگر ان میں کسی ہے تو وہ کس طرح دور ہو سکتی ہے۔ ہم اپنی سہولیت کے لیے اس دور کے کچھ بڑے شاعروں اور ادیبوں پر زیادہ وضاحت سے نظر ڈالیں گے اس اعتبار سے کہ یہ لوگ کن مختلف ادبی تحریکوں کے پیشوا ہیں۔

رجعت اور ٹیگور | حرفتی تہذیب پرانی بنیادوں کو تہ و بالا کر کے زندگی میں خلا پیدا کر دیتی ہے۔ خاندان کا شیرازہ منتشر ہوتا جاتا ہے، دیہاتوں کی خود اطمینانی ختم ہوتی اور شہروں کی ہلکامہ پروری ان پر حاوی ہوتی جاتی ہے۔ سرمایہ داری پرانے بلدھلوں کو توڑ کر نئی راہوں کو بھی بند کر دیتی ہے۔ بچہ اگر بڑا کر بالغ ہو گیا تو اس کی پوشش کے لیے نئے کپڑوں کی ضرورت ہے۔ پرانی تہکاموں میں لپیٹا گیا توپا تو اس کا دم کھٹ جائے گا یا کپڑا پھٹ جائے گا۔ لیکن سادہ لوح والدین اس کس مکش سے گھبرا کر کپڑوں کی قید سے اسے آزاد کرنے کو ہی مصلحت وقت سمجھتے ہیں۔ یہی حالت ان منکرین کی ہے جو راہ ترقی کی دشواریوں سے بچنے کے لیے رجعت کی کلہاڑی سے دنیا کے پیر کاٹنا چاہتے ہیں۔ طالسطانی پر تلتقید کرتے ہوئے 'لہن' ایک جگہ لکھتا ہے کہ "اس کی قوت تخلیقی اور جدت طبع بظاہر سرمایہ داری کے مظالم پر نکتہ چینی کرتی ہے۔ حکومت کے استبداد اور عدالت کی انصاف کشی پر اس کا دل فم و فصہ سے لبریز ہے۔ تہذیب کی فتوحات کے ساتھ جس طرح غریبوں کے خون سے دولت کے ایوان کبڑے ہوتے ہیں وہ ان سب کا جائیزہ لیتا ہے۔ لیکن ان سب سے بڑا کر وہ بانگ دہل ہے جو یہ مجذوب تشدد کے مقابلے میں عدم تشدد کی حمایت میں بلند کرتا ہے۔ طالسطانی میں مظالم کے خلاف نفرت ہے، کسی روشن مستقبل کی تمنا ہے 'ماضی' کی پابندیوں سے

آزاد ہونے کی جدوجہد ہے لیکن ساتھ ساتھ اس کا تصور ابھی خام ہے، شعور سیاسی کی کمی ہے اور تغیر پسندی سے جھجک ہے۔“

قبل از انقلاب - فرانس اور روس کے ادبا اور مفکرین نظام زندگی کی بد عنوانیوں کی عقدہ کشائی کرتے رہے لیکن جب کسی نے آگے بڑھ کر اس کے عملی سدباب کی تدبیر بتائی تو یہ حواس باختہ ہو کر تصوف اور روحانیت کے حجروں میں جا چھپے۔ ہندوستان میں بھی یہی ہو رہا ہے اور تھیکور کو ہم اپنے دعوے کے ثبوت میں پیش کر سکتے ہیں۔

شاعر سوال کرتا ہے کہ ”کوی کی گائیے“ کی شناہے؟ - شاعر تو کیا کائے گا کیا سنائے گا؟ اور خود ہی جواب دیتا ہے: ”دنیا میں جب سب لوگ برسر کار تھے، اکیلا تو آوارہ لڑکوں کی طرح بھاگ کر میدان میں آیا اور بھری دوپہر میں غم دیدہ درختوں کے سایے میں بیتھ کر دن بھر بانسری بجاتا رہا۔ لہہ اب تو اٹھ جا۔

آگ کہاں لگی ہے؟ دنیا کو بیدار کرنے کے لیے کون صور پھونک رہا ہے۔ کسی کی فریاد سے نضا گونج رہی ہے؟ کس قید خانے میں پابہ زنجیر دکھاری مدد کی طلب گار ہے؟

لا تعداد بے بسو کے سینوں کا خون توہین انسانی کو غسل دے رہا ہے۔ خود فرضی درد انسانی پر ہنس رہی ہے۔ وہ بے زبان جو سرنگوں کھڑا ہے۔ جس کے اترے ہوئے چہرے پر صدیوں کے مظالم کی داستان کلدہ ہے، جو جیتے جی ہر قسم کے بار کو اٹھائے چلتا ہے اور پشت در پشت اس بازو مصائب کو ورثے میں چھوڑ جاتا ہے۔ وہ قسمت کا کلمہ گزار نہیں ہے، نہ دیوتاؤں کو کوستا ہے اور نہ انسان کی شکایت کرنا ہے۔ جو کام کرنے کے لیے زندہ رہتا ہے اور زندہ رہنے کے لیے دو مٹھی اناج کے سوا کچھ نہیں

چاہتا اور جب اس مایہ حیات کو بھی کوئی چھین لیتا ہے، جب کوئی فرد عین اس کے اس اٹائے پر بھی دست درازی کرتا ہے تو وہ بد بخت غریبوں کے خدا کو پکار کر جان دے دیتا ہے۔

اسی حسرت نصیب کو قوت گویائی بخشتا ہے۔ اس کے توتے ہوئے دل میں امید کا دیا جلاتا ہے۔ اسے پکار کر کہتا ہے کہ چشم زدن کے لیے سر بلند ہو جا اور پھر دیکھ کہ جس ظالم کے خوف سے تو لرزہ بر اندام ہے وہ تجھ سے کہیں زیادہ بزدل ہے۔ جھوسے ہی تو جائے گا وہ راہ فرار اختیار کرے گا۔ تہرے سامنے آتے ہی وہ راستے کے کتے کی طرح دم ہلانے لگے گا۔ خدا اس کا دشمن ہے، وہ بے یار و مددگار ہے، اس کی چرب زبانی پر نہ جا۔ وہ دل ہی دل میں اپنی ذات پر نادم ہے۔

اے شاعر، اگر تہرے دل میں ذرا بھی احساس ہے تو اسے اپنا ہملوا بنا اور اپنی زندگی اس پر قربان کر۔ غم و اندوہ کی انتہا نہیں اور اس سیاہ خانے کی تاریکی اور الم نصیبی کا کوئی تھکانا نہیں ہے۔ درستی، زندگی اور روشنی کی ضرورت ہے۔ صحت، غم اور آزادی سے دنیا کو مالا مال کرتا ہے۔ اے شاعر، افلاس کی طغیانی میں ایک مرتبہ جنت کے ہوشربا نظاروں کے دروازے کھول دے۔“ (ماخوذ از چترا)

سرمایہ دارانہ تمدن کے خلاف اپنی مشہور نظم ’وسوندھر‘ (زمین)

میں کہتا ہے :—

”یہ چھاسوز خون کی پیاسی بربریت کسی دین و آئین کی قائل نہیں اور نہ کسی رسم و رواج کی پابند ہے۔ اسے فکر فردا ہے اور نہ فکر امروز۔ اس کی زندگی سمت و ساحل سے بے خبر ہو کر دیوانہ وار بھاگ رہی ہے۔ نہ وہ ماضی کی طرف دیکھتی

ہے اور نہ مستقبل کی پروا کرتی ہے - 'آج' کی موجوں پر  
 آوارگی اور حباب آسامیوں کو نچاتی ہوئی وہ اس بے حقیقت  
 ناؤ کی طرح رواں ہے جو اپنا ہر بادباں کھولے کسی راہ بے  
 منزل کی طرف جا رہی ہو -

لیکن بجائے اس کے کہ وہ ان تملقات کی بربادی کا آرزو مند ہو  
 جو انسان کے لیے آتش زیر پابن گئے ہیں وہ پیداوار کے تمام جدید  
 ذرائع کو مٹا کر دور وحشت کی طرف لوٹ جانا چاہتا ہے - تہذیب سے  
 خطاب، نامی نظم میں کہتا ہے: "اے نئی تہذیب، مجھے وہ پرانے دشت و  
 جبل لوٹا دے اور اپنے اس شہر کو - اس لوہے، پتھر اور لکڑی کے مقبرے  
 کو واپس لے لے - اے انسانیت سوز تہذیب لکیم، ایک بار پھر وہ عبادت گاہ  
 مجھے لوٹا دے جس کا سایہ عاطفت نیکی کا کھوپڑہ تھا... میں آزادی چاہتا  
 ہوں، اپنے بازوؤں کو پوری طرح پھیلانا چاہتا ہوں - اپنے سینے میں پھر ان  
 کھوے ہوئے جذبات کو جگمگہ دینا چاہتا ہوں اور تمام پابندیوں کو توڑ کر  
 اپنے دل کو اس دنیا کا آئینہ بنانا چاہتا ہوں -"

ٹیگور کا کوئی ادبی کارنامہ حال اور ماضی کے اس تنازع سے خالی  
 نہیں ہے - زمانہ حال سے اسے سخت نفرت ہے، سرمایہ دارانہ تمدن کا وہ  
 گلہ گزار ہے - یہ تمدن مادی مطالبات سے روح کو گراں بارہی نہیں کر رہا  
 ہے بلکہ اس کے وجود سے انسان کو بے پروا بنا رہا ہے - زندگی ابد تک  
 وسیع کیا ہوتی بلکہ 'آج' اور 'ابھی' کی ایک ساعت میں سمٹ رہی ہے -  
 'ٹیگور' یہ خوب سمجھتا ہے کہ نظام معاشی کی افراطی نے ہی یہ ستم  
 برپا کیا ہے - روس کی سیاحت کے اثنا میں وہ پروفیسر پیٹروف کو لکھ  
 چکا ہے کہ روس کی اس ترقی کا راز یہ ہے کہ وہاں دولت پر کسی ایک

طبعی کانہیں بلکہ پورے ساج کا قبضہ ہے۔ تاہم اپنے ملک کے مسائل کا کوئی حل اس کی سمجھ میں نہیں آتا سوا اس کے کہ لوگ جنگوں اور پہاڑوں میں تصوف کی الجھنوں کو سلجھاتے رہیں۔ امید و بیم کے دو متضاد جذبات اس کے کلام میں جا بجا ملیں گے۔ انسانیت کے مستقبل پر اس کا ایمان ہے لیکن تغیر کب اور کیسے ہوگا یہ وہ نہیں بتا سکتا۔ یہ رنگ عمر کے ساتھ زیادہ نمایاں ہوتا جاتا ہے اور 'سونار تری' (سنہری کشتی) میں جس نامعلوم منزل کا پتا دریافت کیا گیا تھا شاعر اپنے آخری مجموعہ 'بلا کا' میں بھی اسی کی تلاش میں سرگرداں ہے: "جو دریائے زندگی میں اتر چکا وہ ساحل کی پروا کیوں کرے؟ کشتی کا آسرا کیوں ڈھونڈے؟ ناخدا کا احسان کیوں اٹھائے؟ اس کارواں کی کوئی منزل مقصود نہیں، نہ وہ کہیں تھیرتا ہے، اور نہ کہیں آرام لیتا ہے۔ راہ میں کہیں دم بھر آرام لیے بغور وہ اس راستے پر چلتا رہتا ہے جس کا اور چہرہ نہیں ملتا۔"

اس کی اکثر نظمیں اس فقدان مقصد کو ظاہر کرتی ہیں مثلاً:

"انسان کی وہ آوازیں میرے کان میں گونج رہی ہیں جو کہہ آلود ماضی سے نکل کر بعید از فہم ابد کی طرف کسی نا معلوم رستے سے سفر کرتی جا رہی ہیں۔ اور اپنے دل میں اس آشیاں بدر پرندے کی فریاد سلتا ہوں جو لاتعداد پرندوں کے ساتھ اس دھوپ چھانو سے نکل کر معلوم نہیں کہاں سے کہاں جا رہا ہے۔ اس کا یہ نغمہ فضا کو مترنم کر دیتا ہے کہ یہاں نہیں کہیں اور، کہیں اور، کسی دوسری جگہ۔"

راہ نہ معلوم ہونے کی وجہ سے شاعر کی جستجو نا کام رہ جاتی ہے اور وہ تصوف کے الجھیرے میں الجھ کر انجام کار حزنیت کا شکار ہو جاتا

ہے۔ چنانچہ اس کی پچھلی نظموں میں سے اکثر موت 'عدم' فلما اور پیری کا نوحہ سناتی ہیں۔ وہ ٹیگور جس نے بلکال کی سودیشی تحریک سے متاثر ہو کر لکھا تھا کہ "اگر تیری پکار سن کر کوئی نہیں آتا تو نہ سہی تو اکیلا ہی بڑھا چل" — جس کے ولولہ انگیز نغمے نے انقلاب پروردوں کو دار و درسن پر امید کا چراغ دکھلایا تھا — "اگر رات اندھیری ہے اور کوئی راستہ نہیں دکھاتا تو اپنے سینے کی ہڈیوں کو مشعل راہ بنا اور اکیلے ہی چلا چل" — اس کا جسم ہی نہیں روح بھی بوزی ہو چکی اور اس کا پچھلا مجموعہ کلام اس کی بے راہ روی کا افسانہ ہے —

گاہے گاہے ٹیگور رفارمر کی صورت میں بھی نظر آتا ہے۔ "گورا" اور "کمدنی" نامی ناولوں میں سماج کی ناپاکیوں کو دکھانے کے بعد وہ تعلیم یافتہ طبقے سے انصاف اور اصلاح کی اپیل کرنے لگتا ہے اور سمجھتا ہے کہ اس نظام میں بنیادی تبدیلیوں کے بغیر برائیاں دور ہو سکتی ہیں — فریبوں میں وہ نمک حلائی اور ایمان داری کے جذبات پیدا کرنا چاہتا ہے اور امہروں کو رحم دلی اور انصاف پروردی کی تلقین کرتا ہے۔ اپنی ایک نظم "بوزھا نوکر" میں اس ملازم کا تذکرہ دو رو کر کرتا ہے جو لاکھ تکلیفیں جھیل کر بھی اُف نہیں کرتا اور مالک کو خدا ماننا ہوا اس کی چوکھٹ پر مر جاتا ہے۔

بہر نوع جہاں تک استعمار کا سوال ہے 'ٹیگور' اس کا مخالف ہے۔ بعد از آں اس کے پیغام میں ثنویت (Dualism) پیدا ہو جاتی ہے۔ سرمایہ دارانہ تمدن کو وہ سرمایہ دارانہ نظام کا نہیں بلکہ مشیلوں کے رواج کا لازمی نتیجہ سمجھ کر اس سوچ میں پڑ جاتا ہے کہ آگے چلوں یا پیچھے بھاگوں۔ اور جب ملوکیت کو فلما کرنے کے لیے اس سے عملی تدبیریں دریافت کی

جاتی ہیں تو وہ اصلاح، عدم تشدد اور تصوف کی تبلیغ کرنے لگتا ہے۔ تاہم ٹھیکور کے کلام کا بڑا حصہ ادب جدید کے لیے قابل قبول ہے اور یہ خیال بڑی حد تک غلط ہے کہ وہ عمل کا دشمن ہے۔ ٹھیکور ہر گام پر پیغام عمل سناتا ہے اور اس لحاظ سے اپنے معاصرین سے کہیں بلند اور قابل احترام ہے کہ اس کا پیغام کسی خاص دور یا مخصوص جماعت کے لیے نہیں ہے۔ اس کا نقطہ نظر بین الاقوامی اور زمان و مکان سے بالاتر ہے۔

اکبر الہ آبادی مرحوم رجعت اور قدامت کے سب سے بڑے علم بردار گذرے ہیں اور ان کا طلوع از آغاز تا انتہا مغرب پرستی کے ماتم سے بھرا ہوا ہے۔ یہ ان بوزہ والدین کے شاعر ہیں جن کا تمدن دیسی جونو، پگڑی اور اچکن تک محدود ہے اور جن کا مذہب چھکڑوں پر چل سکتا ہے، دیل گازی سے اسے بعد ہے! یہ سامنتی تمدن کا شدید احتجاج تھا جو طنزیہ تک بلدی میں کفر کے فتوے صادر کر رہا تھا۔ یہ کہنا لا حاصل ہے کہ یہ ادبی رجحان عام تھا جو نئی روشنی اور پرانی روشنی کے اس تغاڑع کا پر تو ہے جو اب بھی ہر ہندوستانی خصوصاً ہر مسلمان خاندان میں شدومہ کے ساتھ جاری ہے۔ سامنتی تمدن مغربیت کے نرفے سے نکلنے کے لیے نئی نئی ترکیبیں سوچتا ہے۔ کبوی وہ انگریزی تعلیم کا یک لخت مخالف ہو جاتا ہے اور کبھی ملازمتوں کی لالچ سے یہ نظریہ پیش کرتا ہے کہ مغرب سے اچھی اچھی چھریں لے لی جائیں۔ چنانچہ ہمارے ادبا کا ایک گروہ اب اس حد تک صالح کرنے پر تیار ہے کہ مشرق و مغرب یعنی سامنتی اور حرفتی تہذیبوں میں مہل کرا دیا جائے۔ اس لچر نظریہ کی مقبولیت کا سبب یہ ہے کہ ہڈوز ہمارے ملک میں سامنتیت کے کہندار باقی ہیں اور صمت و حرفت کو وہ فروغ نصیب نہیں ہوا جو ماوکیت سے آزاد ہو کر ہی حاصل

ہو سکتا ہے - بہر حال، 'تھگور'، 'اقبال'، 'جوش' اور 'ارد شیر خبرد' جیسے استعمار دشمن شاعروں نے بھی 'مشین' اور 'مشین کے مالک' کے امتیاز کے سمجھنے میں غلطی کی ہے اور تقسیم کی بے عنوانی سے تلگ آکر پیداوار کے ذرائع کو مٹا دینا چاہتے ہیں - جو غلطی سیاسی میدان میں گاندھی جی اور دوسرے سامنتی رہنما کر رہے ہیں، اس کا اعادہ دنیائے ادب کے یہ اکابر بھی کر رہے ہیں - ظاہر ہے کہ ان جذبات کی مقبولیت مادی اعتبار سے دنیا کو پیچھے لے جائیگی کیونکہ تہذیب کے مستقبل کا انحصار قدرت اور انسان کی جنگ کے نتیجے پر ہے - اس لیے یہ نظریہ انسان کی شکست اور پسپائی کا اعلان ہے -

فاسیزم (fascism) اور اقبال -

اقبال کا نظریہ زندگی بڑی حد تک اس تحریک سے متاثر ہے جس کے بانی 'جمال الدین افغانی' تھے - مشرق نے مغربی استعمار کی چیرہ دستیوں کے خلاف جو احتجاج شروع کیا اور یورپ میں نیشنل، برگساں اور مہزنی نے حرفتی تہذیب پر جو اعتراضات کیے اقبال ان سے بھی اثر پذیر ہوا - وہ اسلام کے نام پر ایک تصور عالم پیش کر رہا ہے اور اس کی رائے میں مسائل زندگی کا واحد حل یہ ہے کہ دنیا اس تصور کو عملی جامہ پہنائے - یہاں میں صرف یہ دکھانے کی کوشش کروں گا کہ اقبال فاسطیت کا ترجمان ہے اور یہ درحقیقت زمانہ حال کی جدید سرمایہ داری (neo-capitalism) کے سوا کچھ نہیں ہے - ظاہر ہے کہ فاسیزم پر کوئی جامع بحث اس مضمون کے احاطے سے باہر ہے لیکن اگر ضرورت ہوئی تو اپنے تجزیہ کی تائید میں بعد از آن ثبوت پیش کروں گا -

سلطنت (State) بجائے خود کوئی ملکہ نہیں بلکہ سماج کے تعلقات انسانی کی محافظت کا ایک آلہ ہے اور چونکہ ان تعلقات کا انحصار ذرائع پیداوار کی ملکیت

پر ہے اور وہی طبقہ سماج میں بوسر اقتدار ہوتا ہے جس کے ہاتھ میں کلید ملکیت ہے لہذا سلطنت، تہی دست طبقے کی پامالی کے لئے ' طبقہ غالب، کی انجمن کارساز ہے۔ ارتقائے انسانی کے لئے ضروری ہے کہ زمام سلطنت اس طبقے کے ہاتھ میں رہے جو پیداوار کے ذرائع کو زیادہ سے زیادہ ترقی دے سکے۔ سرمایہ دارانہ نظام نے یہ فائدہ ضرور پہنچایا کہ سامنتی سماج کی بنیاد کو فنا کر کے مشینوں کے رواج کو عام کر دیا۔ لیکن اس کی عمر طبعی اسی روز ختم ہوگئی جب وہ پیداوار اور اس کی تقسیم میں ارتباط قائم نہ کر سکا۔ کیونکہ دور حرفت اجتماعی پیداوار کا زمانہ ہے اس لئے ضروری ہو گیا کہ پیداوار کے ذرائع پر چلک لوگوں کی ملکیت نہ ہو بلکہ پورا سماج اس کا مالک اور منتظم ہو۔ یہ تبھی ممکن ہے جب وہ محنت کش طبقہ سلطنت کی باگ توار اپنے ہاتھ میں لے جو اقتصادی قالب کو اس طریقے سے بدل سکتا ہے۔ سرمایہ داری انحطاط پزیر ہوتی جاتی ہے اور اپنے کو زندہ رکھنے کے لیے وہ نئے حیلے تراشتی اور نئے معاونین تلاش کرتی ہے۔ مشین نے معاشیات کو قوم و ملک کی حدود سے نکال کر بین الاقوامی بنا دیا ہے اور اب اس کے فروغ کے لیے ضروری ہے کہ قومی حکومت کی پابندیاں توڑ دی جائیں اور مالیات و سیاسیات میں امتزاج پیدا ہو جائے۔ لیکن وطنی سرمایہ داروں کی جماعتیں یوں خود کشی نہیں کر سکتیں۔ بہن اقوامیت کے چڑھتے ہوئے دریا کو روکنے کے لئے وہ نئی دیواریں باندھنے لگتے ہیں۔ وہ کہتے لگتے ہیں کہ ہمارا ملک یا ہماری قوم یا ہمارا مذہب یا ہماری نسل دنیا میں سب سے زیادہ افضل اور اکمل ہے۔ اطلالیہ قدرت کی طرف سے دنیا کے نام ایک خاص پیغام لایا ہے! جاپانی برگزیدہ بلدے ہیں، جرمن خدا کی بہترین مخلوق ہیں! وہ اپنا فرض اسی حالت

میں ادا کر سکتے ہیں کہ آپس کی خانہ جنگیاں بند ہوں۔ رعایا کا ہر فرد عام اس سے کہ وہ سرمایہ دار ہے یا مزدور صرف ایک حاکم کا اطاعت گزار ہے۔ ہیگل اور اس کے جرمن متاخرین سلطنت کو اس تصور (Idea) کی تعبیر بناتے ہیں جس کے حصول کے لیے سماج ارتقا بالذد کی سیڑھیوں پر چڑھ رہا ہے۔ پارلیمنٹری نظام حکومت صرف اس حالت میں قابل قبول تھا جب تک مالیات میں عدم مداخلت (laissez faire) کے اصول پر عمل ہو سکتا تھا۔ لیکن اب مزدوروں کی تحریک کو کچلنے اور ساتھ ساتھ سلطنت میں یک جہتی رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ جمہوریت کو فنا کر کے ڈکٹیٹری قائم کئی جائے۔ ڈکٹیٹر ایک انسان برتر ہے جو ہر طبقے کے ساتھ انصاف کرتا ہے جو ہر قسم کے طبقاتی اور نسلی تعصب سے بالا ہے۔ وہ سرمایہ داری کی سرکوبی کرتا ہے اور مزدوروں کو 'انتہا پسندی' کی طرف نہیں جانے دیتا! پھر اس کا وطن دنیا کا پیشوا ہوگا، اس لئے وہ قومی اور وطنی تہذیب کا نگہ بان بھی ہے! اشتراکیت میں وطنیت، قومیت اور روحانیت کے لئے جگہ نہیں ہے اور چونکہ متوسط طبقے کو ان چیزوں سے بڑی دلچسپی ہوتی ہے، اس لیے وہ ہمیشہ ان کی دواہائی دیا کرتا ہے۔ اس طبقے کے نوجوان پرناسیست حکومت کے پشت پناہ ہیں —

اقبال ایک قوم کو ہی نہیں بلکہ اس قوم کے ایک خاص طبقے کو مخاطب کرتا ہے۔ یہ طبقہ نوجوانوں کا ہے۔ تاریخ اسلام کا ماضی اسے بہت روشن اور شاندار معلوم ہوتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ مسلمانوں کا دور فتوحات اسلام کے عروج کی دلیل ہے اور ان کا زوال یہ بتلاتا ہے کہ مسلمان اسلام سے منحرف ہو رہے ہیں۔ حالانکہ یہ ثابت کرنا مشکل ہے کہ اسلام کی ابتدائی فتوحات عرب ملوکیت کی فتنہ جات نہیں تھیں

اور تاریخ کے کسی دور میں کبھی اسلامی تصور زندگی پر عمل بھی ہوا تھا - بعد از آن، مسلمانوں نے جو کچھہ کیا وہ قطعاً غیر اسلامی تھا - اور ممکن ہے کہ وہ روحانی اعتبار سے مسلمان ہوں لیکن اسلام کے سماجی تصور سے انہیں کچھہ زیادہ واسطہ نہ تھا - بہر حال، وطنیت کا مخالف ہوتے ہوئے بھی 'اقبال' قومیت کا اس طرح قائل ہے جس طرح 'مسولہائی' - اگر فرق ہے تو صرف اتنا کہ ایک کے نزدیک قوم کا مفہوم نسلی ہے اور دوسرے کے نزدیک مذہبی - فاسستوں کی طرح وہ بھی جمہور کو حقیر سمجھتا ہے :

متاعِ معنئی بیگانہ از دوں فطرتاں جوئی  
 زموراں شوخیء طبعِ سلیمانی نمی آید  
 گریز از طرزِ جمہوری غلامِ پختہ کارے شو  
 کہ از مغزِ دو صدخرِ فکرِ انسانی نمی آید

( جمہوریت از پیام مشرق )

فاسیزم اور اشتراکیت میں ایک فرق یہ بھی ہے، کہ جہاں اول الذکر عوام کو پیدایشی خربتا ہے، وہاں اشتراکیت ان کی کم فہمی کو ماحولی سمجھتی ہے اور بنا بریں اس ماحول کو بدلنے کی ضرورت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ فاسیزم کا ہمنوا ہو کر وہ اشتراکیت اور ملوکیت دونوں کی مخالفت کرتا ہے۔

ہر دورا جانِ ناصبور و ناشکیب      ہر دو یزدان ناشناس، آدم فریب  
 زندگی این را خروج، آن را خراج      در میان این دو سنگ آدم زجاج  
 فرق دیدم ہر دورا در آب و گل      ہر دو را تن روشن و تاریک دل  
 ( اشتراکیت و ملوکیت از چارید نامہ )

ملرکیت و سرمایہ داری کا وہ اس حد تک دشمن ہے جس حد تک متوسط طبقے کا ایک آدمی ہوسکتا ہے - بلدہ اور بلدہ نواز کی تفریق

بظاہر مت جائے اور محسود و ایاز ایک صف میں کھڑے ہو کر نماز پڑھ لیں! مشینوں کا رواج انسانیت کے لیے مضر تر رساں ہے:

ہے دل کے لیے موت مشینوں کی حکومت احساسِ مروت کو کچل دیتے ہیں آلات  
در آن حالیکہ آلات خود کچھ نہیں کرتے، بلکہ وہ مخصوص حالات  
مروت کو کچل دیتے ہیں جن میں ان سے کام لیا جاتا ہے۔ آلات تو مال  
پیدا کر دیتے ہیں، اب یہ انسان کا کام ہے کہ اس کی تقسیم مناسب طریقے  
سے کرے۔ 'اقبال' مزدوروں کی حکومت کو چلداں پسند نہیں کرتا —

زمامِ کار اگر مزدوروں کے ہاتھوں میں ہو پھر کہا

طریقِ کوہکن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی

ہوس اندر دل آدم نہ مبرد ہماں آتش میانِ ہر زغن ہست

عروس اقتدار سحر فنِ را ہماں پیچاک زلف پرشکن ہست

نماند ناز شہریں بے خریدار اگر خسرو نباشد کوہکن ہست

( از پیام مشرق )

سرمایہ داری اور ملوکیت کی موجودہ بنیادوں کو متاثر نظام  
معاشی کو از سر نو قائم کرنے کے لیے 'اقبال' ایک تصور عالم پیش کرتا  
ہے۔ لیکن ایک بین اقوامی تصور کا عامل اس کے نزدیک ایک بین اقوامی  
طبقہ نہیں بلکہ ایک قوم ہے جس میں ایک بہت بڑا گروہ ایسے لوگوں  
کا بھی ہے جو 'اقبال' کی نظر میں بھی مسلم نما کافر ہیں اور اس کی  
تحریک کے سب سے بڑے مخالف یہی لوگ ہوں گے۔ اپنے خواب کی تہیہ  
اطالوی فاسیست میں دیکھ کر وہ جوش سے کہتا ہے:

رومتہ الکبرا! دگرگوں ہو گیا تیرا ضمیر

ایلکے می بیلم بہ بیدار یست یارب یا بخواب

چشمِ پیرانِ کہن میں زندگانی کا فروغ  
 نوجوان ہیں تیرے سوزِ آرزو سے سینہ تاب  
 یہ محبت کی حرارت! یہ تمنا! یہ نمود!  
 فصلِ گل میں پھولِ رہہ سکتے نہیں زیرِ حباب  
 نغمہ ہاے شوق سے تیری فضا مغمور ہے  
 زخمِ ور کا منتظر تھا تیری قطرت کا رباب  
 فیض یہ کس کی نظر کا ہے؟ کرامت کس کی ہے؟  
 وہ کہ ہے جس کی نگہ مثلِ شعاعِ آفتاب  
 (مسولہنی از بالِ جبرئیل)

یہ فیض 'مسولہنی' کا ہے جو اطالیہ کی بہبودی کے لیے ساری دنیا کو فنا کر سکتا ہے، جو اطالیہ کے سرمایہ داروں کا سپہ سالار ہے، جو جنگ کو انسانیت کے لیے شہرِ مادر بتاتا ہے - 'اقبال' ایسے ڈکٹیٹر کو ہی اسلامی پاکستان کے استحکام کا ضامن سمجھتا ہے - خلافت کا تصور اس کے نظریے کی تائید کرتا ہے حالانکہ 'خرانِ جمہور' میں وہ 'طبعِ سلطانی' کہاں جو اس ڈکٹیٹر کو 'مشورہ' دے سکے -

مختصر یہ کہ 'اقبال' اسلامی فاسیت ہے اور اس کا رد عمل بھائی پرمانند اور ڈاکٹر منچے کے ہندو فاسیزم کی صورت میں ظہور پذیر ہو رہا ہے جن کے نزدیک ویدک عہد کی تہذیب انسانیت کی معراج، اور ذاتِ پات کی تقسیم، تقسیم عمل کا بہترین نمونہ ہے!

ادب اور قومیت | ہندو مسلم نفاق دراصل دو مختلف تہذیبوں کی کش مکش ہے اور ہم دیکھ چکے کہ کس طرح 'تہگور' اور 'اقبال' ایذا تصور عالم پیش کر کے ان متضاد رجحانوں کو ظاہر

کر رہے ہیں۔ سیاسی اغراض کی خاطر ہر دو قوم کے متوسط طبقوں میں باہم اتحاد اور امتزاج کی جو تحریک شروع ہوئی تھی وہ بھی ادب ہند پر ایک نقش چھوڑ گئی ہے اور دونوں قوموں کے کئی ادیب خالص وطنی اور قومی جذبات سے متاثر نظر آتے ہیں۔ وہ ہندوستانیوں کو ترغیب دیتے ہیں کہ خانہ جنگیوں کو بند کر کے غیر ملکی حکومت کے خلاف اپنا معاذ قائم کریں۔ ان کے نزدیک وطن سب کچھ ہے۔ وہ یہ بھی نہیں سوچنا چاہتے کہ آئندہ حکومت کا دستور کیا ہوگا۔ بس انگریزوں کے جاتے ہی کوئی جادو کی چھڑی ہر معاملے کو درست کر دے گی گویا سماج کی تمام برائیاں صرف ان سے وابستہ ہیں۔ ظاہر ہے کہ اب تک جو سیاسی تحریکیں اس ملک میں اُٹھ اُٹھ کر گرتی رہیں وہ اس قوم پرورانہ جذبے سے متاثر تھیں جس کے پیچھے دیسی سرمایہ دارانہ مفاد کام کر رہے تھے۔ اردو میں 'چکبست'، 'جوش'، اور 'ساغر نظامی'، ہندی میں 'نوبین'، ایک 'بھارتیہ آتما' اور 'بابو میتھلی شرن گپتا' انگریزی میں 'سروجنی نائیڈو' اور 'ہرین چٹرجی'، گجراتی میں 'ارد شیر خبرداد' اور دکن میں 'اناکولا' اس قومی رجحان کے ترجمان ہیں۔ ہندو مسلم تفریق کو مٹا کر ایک قوم کو جنم دینے اور ہندی اور اردو کی آمیزش سے ایک زبان وضع کرنے کا بھی سامان ہو رہا ہے۔ چنانچہ صرف نثر میں ہی نہیں بلکہ نظم میں بھی اردو والے ہندی کے اور ہندی والے اردو کے بکثرت الفاظ مستعمل کرنے لگے ہیں۔ تحریک اتحاد کے بعد ہی اردو میں ہندی گیتوں کی مقبولیت ہوئی اور ہندی میں مشہور شاعر 'ہری اودہ' کی تھیٹ ہندی کو قبول عام میسر آیا۔ ان کے چورپدے پڑھیے تو بہ اعتبار زبان وہی لطف آتا ہے جو 'آرزو لکھنوی' کی خالص اردو میں —

قومی تحریک کا سب سے بڑا شاعر شاید 'ارد شیر خبردار' ہے۔ گجرات میں آج اس کا وہی مرتبہ ہے جو اردو میں اقبال کا اور بنگالہ میں 'تھگور' کا۔ وہ کوئی ہلکامی شاعر نہیں بلکہ قومیت کے نظریے کی تہہ تک پہنچتا ہے اور اس کا مجموعہ کلام 'درشلکا' (فلسفہ) بمبئی یونیورسٹی کے نصاب میں داخل ہے۔ اس کا ترانہ 'گڈونتی گجرات' اقبال کے ترانے یا قی۔ ایل۔ راے کے 'بڈگ آمار لچھمی بھومی' سے کم مقبول نہیں ہے۔ وہ سخت قسم کا وطن پرست اور قوم پرورد ہے۔ اپنی ایک نظم میں کہتا ہے —

”اے مادر وطن! روز آفرینش سے جس کے خوابوں کا ہار تھرے تاروں سے گوندھا گیا ہے —

جو مرتے دم تک تیرے ہی نام کو بوسے دیتا ہے۔

اے ماں، اُس نے تجھے پہچان کر اپنی خودی کو سمجھا ہے۔

جب میں مرجاؤں تو تیری خاک پاک سے دوبارہ جنم لوں تاکہ

تجھے پر دوبارہ قربان ہوسکوں۔ تیری مٹی میرے لیے مایہ حیات ہے، کیونکہ خالق کے پرستار کی مٹی میں تمام مخلوق ہے۔ —

ایک دوسری نظم میں ستیاگرہ کی تبلیغ یوں کرتا ہے: ”آج اپنے

ساتھ کیا کیا لوگے؟ جرأت تلوار میں نہیں دل میں رہتی ہے۔ کات تمہاری ہمت مردانہ میں ہے ورنہ ہر تلوار بے آب ہے۔ ان کدھتہ ہاروں کو پھینک کر دل کو جاگ کے لیے مستعد بناؤ۔ ہمیں کسی کا خون نہیں بہانا ہے۔ حریف کے خون جگر سے ہم اپنے دل کے دیوتا کو کہوں کر ناپاک کریں۔

جس فتح کی تاریخ انسان کے خون سے لکھی جاتی ہے وہ بے پایاں ہے۔ —

مغربیت نے اتنا فائدہ ضرور پہنچایا کہ ہمارے ادب اور تحریک اصلاح | ارباب حل و عقد اپنی آنکھوں کے شہتیر کو دیکھنے

لگے۔ یہ محسوس کیا جانے لگا کہ ان کی موجودہ زندگی کسی نہ کسی حد تک بے ربط ضرور ہے۔ چنانچہ ہندوؤں میں سماج سدھار کی تحریک زور شور سے چل پڑی۔ سوشل معاملات میں کم عمری کی شادی، بیواؤں کی بد حالی اور مردوں کی تماش بیانی کے خلاف آوازیں بلند ہونے لگیں۔ گجرات میں گوندرام نے اور بلکال میں 'ڈیگور' اور 'شرت چند' نے اس تحریک کی حمایت میں افسانے لکھے۔ ادھر مسلمانوں کی ہر برائی بھی چونکہ برگزیدہ ہے اس لیے 'قاضی سرفراز حسین' اور 'راشد الخیری' نے چند پیش پا افتادہ مسائل پر اکتفا کیا اور ایک عرصے تک کسی کو جرأت نہ ہوئی کہ ایک تیز نشتر لے کر اس ناسور کو دکھائے جس نے سماج کے رگ و پے میں زہر ساری کر دیا ہے۔ اس طرف دو کتابیں ایسی شائع ہوئیں جو قابل توجہ ہیں اور مسلمان تعلیم یافتہ جماعت میں ایک نئے رجحان کا پتہ دیتی ہیں۔ انکارے، افسانوں کا ایک مجموعہ ہے جو اب ضبط ہو چکا۔ یہ افسانے ہماری جنسی زندگی کا مرقع تھے اور حالانکہ ان کا انداز تحریر جنسی تشدد سے متاثر تھا اور اس ذہنیت کا آئینہ دار تھا جو روح یا پیمت کی طرح محض جنس ہی کو واحد شعبہ زندگی قرار دیتی ہے، تاہم اردو افسانہ نگاری میں یہ پہلی مثال ہے کہ ادب نے مذاقانہ بلندیوں پر اپنے فرائض کو ترجیح دی ہو۔ دوسری کتاب 'لہلی کے خطوط' ہے۔ افسوس کہ اس کے مصنف نے مظلوم نسوانیت کا ترجمان ایک شاہد بازاری کو بنا کر اس مسئلہ کو محدود بنا دیا اور شہری زندگی میں طوائف کی ناگزیریت کو نظر انداز کر دیا ورنہ اس کتاب کا شمار ہندوستان میں دور جدید کی اچھی تصنیفوں میں ہوتا۔ تاہم اس کی مقبولیت یہ ظاہر کرتی ہے کہ اس طبقے کے کچھ لوگ محض

اصلاح کو ہی کافی نہیں سمجھتے اور یہ بھی دیکھنے لگے ہیں کہ ان برائیوں کو دور کرنے کے لیے نظام زندگی میں بنیادی تبدیلی کرنی ضروری ہے۔

اقتصادی مسائل میں طبقاتی تصادم (Class-war) کا مطلع صاف ہوتا جاتا ہے اور واقعیت نگار ادیب اس طرف بھی متوجہ ہونے لگے ہیں۔

'پریم چندر' کے تقریباً سبھی کردار اصلاح پسند (Reformist) ہیں۔ اس کے سامنے ایسے خوش حال زمین داروں کی مثالیں ہیں جو 'طالستانی' کے 'رستری' (Resurrection) کی طرح کسانوں میں اپنی جائداد تقسیم کر کے اپنی زندگی کو خدمت خانی کے لیے وقف کر دیتے ہیں۔ عورتیں اپنے ذریعوں سے نکل کر مردوں کے دوش بدوش قومی زندگی کی تدوین میں حصہ لے رہی ہیں۔ 'سجان سنگھ'، 'پریم شنکر' اور 'ونییے کمار' اسی قسم کے نوجوان ہیں۔ 'سمن'، 'گاپتری' اور 'صوفیہ' ایسی ہی عورتیں ہیں۔ لیکن جب ایسے زمین دار مستثنیات میں شمار ہوتے ہیں اور اس کلیہ کو ثابت کرتے ہیں کہ اپنے حقوق سے کوئی طبقہ برضا و رغبت دست بردار نہیں ہوتا تو پریم چندر سوچ میں پڑ جاتا ہے اور راہ انقلاب کی آتش اندوزیوں سے اس کی آنکھیں خورہ ہو جاتی ہیں۔ طالستانی اور تھگور کے نقش قدم پر چلتے ہوئے وہ انقلاب اور رجعت کے دوراھے پر ایک تہندی سانس بھر کر یہ کہتا ہوا بہتہ جاتا ہے کہ اے کاش اس رستے پر چلے بغیر ہم وہاں پہنچ جاتے!۔

اصلاح کی ہر تحریک نیک نیتی لیکن تنگ نظری پر مبنی ہے۔ زندگی اور موت میں اتحاد نہیں ہو سکتا اور نہ ظالم و مظلوم کو ایک لڑھی میں گونداھا جاسکتا ہے۔ اسی طرح تعلقات جلسی میں اس وقت تک توازن، استحکام و صحت کی گنجائش نہیں جب تک زندگی کے دوسرے

مسائل سے ہم اسے الگ کر کے دیکھنے کی عادت نہ چھوڑ دیں اور تروفہبات جنسی کو شیطان کا غلبہ نہیں بلکہ ایک فطری جبلت (instinct) نہ سمجھنے لگیں۔ —

ادب اور فقدان مقصد | پل صراط کی طرح انقلاب کا راستہ بھی بڑا دشوار گزار ہے۔ بہت سے لوگ راہ میں تھک تھک کر رہ جاتے اور تصوف کی خندق یا نراج کی گھاٹی میں گر پڑتے ہیں۔ ہندوستان ایک دورِ تغیر سے گزر رہا ہے اور تعلیم یافتہ طبقے کا ایک گروہ لازمی طور پر داخلی کش مکش میں مبتلا ہے۔ اس کے لیے زندگی کی حقیقت ایک رقصِ شرد سے زیادہ نہیں ہے۔ اس کی زندگی کا کوئی معیار یا مسلک نہیں ہے۔ ماضی اس کے لیے بے معنی اور مستقبل لاپرواہی ہے۔ جو کچھ ہے 'ابھی' اور 'آج' کی مسرتوں میں ہے۔ شراب و شباب کا یہ فلسفہ پہلے بھی اس ملک میں مقبول تھا لیکن ہر جام کے ساتھ توبہ تھی اور ہر معصیت کے ساتھ احساسِ گناہ اور عفوگناہ کی امید۔ لیکن اب مستقبل کی تاریکی خود کشی کے رجحان کو بڑھاتی جاتی ہے اور باہمت بے راہ روم پھینک کر 'کم ہمت لوگ آپ اپنی جان لے کر اور آزاد ملش 'خہام' 'باٹرن' اور 'آسکر وائلڈ' کی قسمیں کھا کر اس نراجی ذہنیت کا ثبوت دے رہے ہیں۔ دنیاے ادب میں اس کا پر تور ومانیت اور 'ادب براے ادب' کی صورت میں آشکار ہوتا ہے۔ حقائق کی تلخ کامیوں سے گھبرا کر انگلستان میں 'باٹرن' اور 'کیٹس' وغیرہ نے سامنٹھت کے زوال کے زمانے میں اور اب یٹس (Yeats) اور ڈی۔ ایچ لارنس وغیرہ نے حرفت کے زوال کے وقت اسی جذبہ شکست کا اظہار کیا ہے۔ ہمارے ملک میں بھی متوسط طبقہ میدانِ کارزار سے گھبرا کر تصوف اور رومانیت کی آڑ پکڑنے لگتا ہے۔ ہندوستان

کا سب سے بڑا ناول نگار 'شرت چندر چٹرجی' اپنے ناول 'چترہیں' (بداخلاق) شہس پرشن (آخری سوال) اور 'شہری کانت' میں ایسے ہی لوگوں کی تصویر کھینچتا ہے۔ بنگلہ اور ہندی میں رومانیت اور ٹیگور سے اثر انداز ہو کر شاعری میں 'چھایہ واہ' یعنی اثادیت (Symbolism) کی تحریک شروع ہوئی اور حقیقت پرستوں کو ایک ہرے تک ان رجحانات کے خلاف برسرِ پیکار رہنا پڑا۔ اردو کے نوجوان شاعروں میں بھی یہ ذہنیت عام ہو گئی ہے اور یہ اصحابِ حسن و عشق کے علاوہ دنیا کی ہر چیز سے بے نیاز نظر آتے ہیں، حالانکہ نہ ان کا عشق بوالہوسی سے علیحدہ کیا جاسکتا ہے اور نہ ان کا مہیار حسن عالم دوشیزگی سے آگے بڑھتا ہے۔ ان کی حبِ نسوانیت دوشیزہ پرستی تک محدود ہے اور اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ جس طرح ہمارے نظامِ زندگی میں عورت اپنی مالی ضروریات کے لئے مرد کی دست نگر ہے اسی طرح مرد اپنی شہوانی ترغیبات کے لئے اس کا غلام بن گیا ہے۔

زندگی میں حسن و عشق کے لئے بی بی جگہ ہے اور شراب و شباب کے لیے بھی۔ لہکن ان کے نام پر زندگی کے مطالبات سے بے پروا ہونے کی کوششیں رجعت پروردانہ اور لائقِ تعزیر ہیں۔

پورے ہندوستانی ادب میں صرف ایک ایسا شاعر ہے جو میکسم نذرالاسلام | گورکی کی کسوٹی پر کھرا اترتا ہے۔ جو انقلاب پرور، قدامت شکن اور تغیر پسند ہے۔ جب ادب کا کام صرف یہ رہ گیا ہے کہ انسان کو دلاے یا سلاے اور یا گمراہ کرے تو اُفقِ بنگال پر ایک ستارے کا طلوع ہوتا ہے جو صراطِ مستقیم کا نشان ہے۔ مختصراً نذرالاسلام کا فلسفہ زندگی یہ ہے کہ زندگی دائم و قائم ہے اور انسان لاشریک اہ اس کا مالک ہے۔ انسان اور قدرت کی کش مکش کا نام تہذیب ہے اور انسانیت کی ترقی

کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس نے کس حد تک قدرت پر فتح حاصل کر لی ہے۔ انسان سب سے افضل اور اکمل ہے۔ دین حق کا مطالبہ ہے ہر قسم کے ظلم کا سدباب اور اخوت و مساوات کا قیام۔ قومیت، سرمایہ داری، تمیز رنگ و نسل اور تفریق مذاہب کو وہ انسانیت کے لیے سم قاتل سمجھتا ہے۔ اس کے خیال میں ایک نسل کو دوسری نسل کی قسمت کا فیصلہ کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ ہر آنے والی نسل زندگی کی محافظ اور ضامن ہے۔

اس لحاظ سے 'نذرالاسلام' کو روحانیت نوازی اور داخلیت سے قطعاً کوئی واسطہ نہیں۔ جب دنیا حیات و مسات کی کش مکش میں ہے تو وہ ایسے وقت میں فلسفہ قدرت پر فور و خوض کو غیر ضروری اور مضر مانتا ہے۔ اس وقت فلسفہ قدور (Philosophy of Values) کی فکر کہیں زیادہ اہم اور مفید ہے۔ جب رجعت اور انقلاب برسر پیکار ہوں تو ادب فصیل پر بہتہ کر واقعیت (Realism) کے کیمرے سے فوٹو نہیں لے سکتا۔ یا تو وہ رجعت کے قلعے میں جا چھپے گا یا انقلاب کے مہدان میں ہوگا اور یا تصوف و داخلیت کے خندق میں جا کرے گا۔ طبیعتاً وہ باغی اور سرکش ہے۔ حسن و عشق کی وادیوں میں گرفتار ہو کر بھی اپنی منزل کو نہیں بھولتا "پجاردن" میں عشق کی ناکامیوں کا رد عمل یوں بیان کرتا ہے: "معلوم ہوتا ہے کہ اب میں اپنی منزل کو پہچان گیا۔ کیوں نہ اب میں موت درآغوش طوفان کا ہم سفر بن جاؤں۔ راستے میں کس کی یاد میں فریاد کرتا پھروں؟ کیوں نہ آتش فشاں پہاڑ اس مرتبہ اپنے غارتگر دھانے کھول دیں؟ کیوں نہ میری گرم گفتاری بغاوت کے جھنڈے لہرا دے اور موت کے ترانے میرے ہم سخن بن جائیں۔ لے آؤ اپنے آتشیں رتھ اور پھونک دو

ہنگام قیامت کے صور! برسائے زہر و آتش میں بجھے ہوئے تیر! برباد کردو  
 اس دنیاے معصمت کو! تپکاؤ یہ خونیں شراب عزرائیل کے گلے میں!“  
 نذرالاسلام کے نزدیک دنیا ہمیشہ دو طبقوں میں بتی رہی ہے۔ اور  
 اس ظالم و مظلوم کی تفریق کو اقبال چراغ مصطفوی سے شراد بولہبی کی  
 ستہیزہ کاری بتاتا ہے۔ لیکن جہاں ایک ”خود گذاری“ و ”نالہ نیم شبی“  
 اور ’گنبد نیلوفری‘ کے تماشوں کا آسرا تھونڈتا ہے، دوسرا مظلوموں کو  
 اتحاد و انقلاب کا درس دیتا ہے :

”میں اس روز مطمئن ہونگا جب مظلوموں کی فریاد فضاے  
 آسمانی میں نہ گونجے گی۔ اور جب میدان جنگ میں تلوار  
 اور خنجر کے خوف ناک ترانے نہ سنائی دیں گے۔ وہ جو ازلی  
 باغی اور میدان جنگ سے نالاں ہے، صرف اسی روز خاموش ہوگا۔“ (باغی)

”وہ جو سمندر کی گہرائی میں، آسمان کی وسعت میں، زندگی کے  
 ہیجان میں ’فضا‘ کی ہر سمت میں موت سے نبرد آزما رہتا ہے۔  
 وہ جس نے بادل کی بیٹیوں کو کلیدز بڈا رکھا ہے کہ جو بجلی کو  
 اپنی مٹھی میں پکڑے رکھتا ہے میں اسی کے آستانے پر سر جھکتا  
 اور اسی کے گیت گاتا ہوں۔“

(پیام شباب)

اپنے عزم راسخ کے لیے وہ کسی معاوضے کی تمنا نہیں کرتا۔ وہ حال  
 کی ترجمانی کر رہا ہے تاکہ انسانیت کا مستقبل روشن ہو زمانہ اُسے یاد  
 کرے گا یا نہیں اسے اس کی پروا نہیں ہے :

”میں زمانہ حال کا شاعر ہوں، مستقبل کا پیغمبر نہیں ہوں۔“

کوئی کہتا ہے کہ اگلے زمانے میں تجھے کون یاد کرے گا۔ کوئی کہتا ہے کہ شاعر کو قید و بند سے کہا نسبت! کسی کا مشورہ ہے کہ تو دوبارہ جیل جا کہ وہیں خوب لکھہ سکتا ہے۔ مولوی میجرے چہرے پر اسلام کی علامت (ڈاڑھی) نہ پا کر مایوسی سے اپنی ڈاڑھی کھجنا نے لگتا ہے۔ ہندو کہتے ہیں کہ اس نے ہندو لڑکی سے شادی کر کے اپنی فرقہ پرستی کا ثبوت دیا ہے۔ گاندھی جی مجھے پر تشدد پسندی کا الزام لگاتے ہیں۔ عورتیں کہتی ہیں کہ یہ دشمنِ نسواں ہے اور مرد مجھے عورت پرست بتاتے ہیں۔ فرض کہ میری جان ضیق میں ہے۔

لوگو، سہو کہ یہ دل انتقام آرد درد کی آگ سے پھنکا جا رہا ہے۔  
تن تلہا خون نہیں بہا سکتا، اس لیے اپنے خون سے یہ نظمیں اکھ رہا ہوں۔  
مجھے اس کی پروا نہیں کہ مستقبل مجھے یاد کرے گا یا نہیں۔  
تمنا صرف یہ ہے کہ جو لوگ خلیقِ خدا کو بہوکوں تزیارہے ہیں  
میری خونچکاں تحریر ان کے لیے پیامِ موت ثابت ہو! "سرمایہ اور محنت  
کے تصادم کے انجام پر سماج کی قسمت کا انحصار ہے۔ وہ طبقہ محنت کش  
ہی ہے جو تقسیم کی بے انصافیوں کو دور کر کے پیداوار کے ذرائع کو  
انتہائے عروج پر لے جا سکتا ہے۔ شاعر اس کی فتح یابی کا ترانہ یوں گاتا ہے:

"وہ مبارک ساعت آپہنچی۔

ہموڑی اور کدالی لیے جو پہاڑوں کو کات کر رکھ دیتا ہے،  
راستے کے دونوں طرف جس کی ہڈیاں بکھری پڑی ہیں،  
تمہاری خدمت کے لیے جس نے قلی اور مزدور کا روپ لیا ہے،  
تمہارا بارِ گلاہ اٹھانے کے لیے جو ہمیشہ خاک آلود رہتا ہے،  
وہی۔ صرف وہی مزدور مکمل انسان ہے۔ میں اسی کے گیت گاتا ہوں۔  
اس کا توتنا ہوا دل ایک نئی دنیا کی تعمیر کرے گا۔

اور نچی عمارتوں میں رہ کر اب یہ توقع نہ کرو کہ یہ خاک نشین  
ہمیشہ تمہارے آگے سر بسجود رہے گا۔

جو لوگ فرط احترام سے مادر گیتی کو اپنا اور ہڈنا بچھونا بنا تے ہیں  
وہ انہیں ہی اپنا وارث بنائے گی۔

میں ان پیروں کو بوسہ دیتا ہوں جن سے لپٹ کر مٹی اپنی پیکانگی  
کے اعلان کرتی ہے۔

آج بے کسوں اور مظلوموں کے خون سے رنگ کر بطن گیتی سے آفتاب  
تازہ پیدا ہوا ہے۔ اب تمام پابندیوں اور بندھنوں کو توڑ کر پھیٹک دو۔  
فلک کیج رفتار کو چاہیے کہ پاش پاش ہو کر ہمارے آشیانے پر گر پڑے۔  
ہمارے سروں پر آفتاب و ماہتاب اور ستارے پھول بن کر برسیں کہ  
ہم نے ایک جہان نو کی داغ بیل ڈالی ہے۔

مزدوروں کی جمعیت کو مژدہ ہو کہ ہم سب ایک ہی کارواں کے  
مسافر ہیں۔ ایک کا دکھ سب کے لیے موجب اندوہ ہے اور ایک کی  
توہین بنی نوع انسان کی توہین ہے۔

آج دنیا کے کل بندھن کٹ رہے ہیں اور ایک عظیم الشان دور بھداری  
کا آغاز ہو رہا ہے جسے دیکھ کر خدا مسکراتا ہے اور شیطان خوف سے لرزتا ہے!“  
نذر الاسلام شباب کا ہمدوش اور انقلاب کا نقیب ہے۔ وہ تغیر کا حامی  
اور جمود کا دشمن ہے۔ وہ قدیم کا حریف اور جدید کا علم بردار ہے۔ وہ  
قدرت اور سماج کے مظالم کے خلاف علم جہاد بلند کرتا ہے اور شاعری کو  
اس مہم میں چھاونی کی کسبی نہیں بلکہ جنگ کی دیوی بنا دیتا ہے۔  
اس کی شاعری ادب ہند کے رستے میں ایک نئی لٹکا رہے جو بتاتی ہے  
کہ آرت موت کا نہیں زندگی کا پروردہ اور خادم ہے۔ وہ اس روح کو متنا

دے گا جو جسم کو قید سمجھتی ہے۔ وہ استعمار و استبداد کو فنا کر کے حسن و عشق کے صحیح جذبات سے انسان کو آشنا کرے گا۔

اس مختصر سے سماجی تجزیے میں ہم نے یہ دکھانے ادب جدید کی ضرورت کی کوشش کی تھی کہ ادب ہند کا دور قدیم

حتمی زندگی سے نا آشنا اور بالکل داخلی تھا۔ کوئی حل پیش کرنا تو درکنار وہ زندگی کے مسائل کو سمجھتا ہے اور نہ سمجھنا چاہتا ہے۔ دور جدید زندگی سے اس حد تک بہکانہ نہیں ہے اور اس کی خدمت کا ولولہ بھی رکھتا ہے۔ لیکن اس کے بتلائے ہوئے راستے بڑی حد تک گمراہ کن ہیں۔

ادب کا فرض اولہن یہ ہے کہ دنیا سے قوم، وطن، رنگ و نسل اور طبقہ و مذہب کی تفریق کو مٹانے کی تلقین کرے اور اس جماعت کا ترجمان ہو جو اس نصب العین کو پیش نظر رکھے کر عملی اقدام کر رہی ہو۔ انسانیت کے دشمنوں کی دشمنی دراصل درد انسانی کی دلیل ہے۔ اب تک ہمارا ادب زندگی کی بے ثباتی اور انسان کی بیچارگی کا نوحہ پڑھتا آیا ہے۔ اب اسے اس جذبہ بزدلی سے نکل کر یہ کہنا چاہیے کہ زندگی ابد الابد تک ہے اور انسان اس کا کار ساز حقیقی ہے۔ قیامت کے معنی یہ ہیں کہ روح الاجتماع داور متعشر بن کر استبداد کو ہمیشہ کے لیے جہلم رسید کرے اور پھر اس زمیں پر ایک ایسے بہشت کی تخلیق کرے جس میں ہر انسان ذمہ جسامتی اور روحانی ترقی کی بلندیوں تک پہنچ سکے۔ انسانیت اور ادب کے مسلک الگ نہیں ہیں اور دونوں کی نجات کا راستہ بھی ایک ہے۔ وہ یہ ہے کہ ستم رسیدہ انسانیت اپنے حقوق اور ان کے غاصبوں کو سمجھے اور ان تمام پابندیوں کو توڑ دے جو اس کے ارتقا کی راہ میں حائل ہوں۔ یہ مضمون اردو کے ادیبوں کے لیے لکھا گیا ہے، لہذا میرا

خطاب ان سے ہے —

ایک طرف پولیس کا وہ پلشن خوار داروغہ ہے جو نا عمر اپنی فرعونیت اور ہوس پرستی کا مظاہرہ کرنے کے بعد تسبیح کے دانوں پر اپنے گناہوں کا شمار کر رہا ہے۔ اسے ایسی کتابوں کی ضرورت ہے جو اسے دلانے اور سنانے میں مدد پہنچائیں۔ پھر وہ مولوی ہے جو دین کے پردے میں سب سے بڑا دنیا دار ہے اور جس کی ہوس پرستی کو اشعار کے اس ناپاک دفتر سے ایک کونہ تسکین ہوتی ہے۔ اور وہ تعلیم زدہ لڑکیاں ہیں جو زن مرید شاعروں کی تہذیبی سانسوں سن کر کسی منجلیوں کے انتظار میں بیٹھی ہیں۔ وہ ایسی کہانیاں پڑھنا چاہتی ہیں جن کی ہیروئن وہ خود ہوں اور جن کے ہیرو خود کشی کر کے بقیروں کی طرح تڑپ رہے ہوں۔ آپ اب تک انہیں لوگوں کے لیے لکھتے رہے ہیں۔ کیا آپ کی آئندہ

ادبی کاوشیں بھی انہیں کے لیے وقف ہوں گی؟ —

دوسری طرف وہ کسان ہے جو سماج کی عمارت کا سنگ بنیاد ہے۔ زمین دار اور سود خوار چونک کی طرح اس کا خون پی رہے ہیں۔ مولوی اس پر خود گزاری اور صبر و شکر کا جادو پھونکتے ہیں۔ اس کی بیوی دوتیوں کے لیے عشوہ فروشی پر مجبور ہے۔ اس کے بچے بھوک سے تلگ آکر آپ کی جیب پر گھات لگائے ہوئے ہیں۔ اور وہ مزدور ہے جو سماج کی عمارت کا ستون ہے۔ وہ مال اس لیے پیدا کرتا ہے کہ مفاد کے نام سے ایک دوسرا شخص اسے ہتھیالے جس کے لیے لغت میں 'مالک' کا لفظ تراشا گیا ہے۔ قید خانے کی کوٹھڑیوں سے بدتر جھونپڑیوں میں پلیگ اور ہیضے میں تڑپ کر وہ بھوکا اور نلکا مزدور اس حسرت میں مرجاتا ہے کہ مارواڑی کا بیاندہ پا کسی امہر کا کتا کیوں نہ ہوا! —

کیا اس کے حال زار نے کبھی آپ کے دل میں چٹکی لی ہے؟ کیا کبھی آپ نے سوچا ہے کہ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ کیا کبھی ان اسباب و علل کو مٹانے کا خیال آپ کے ذہن میں آیا ہے؟ - اگر نہیں تو آپ ادب کے لیے باعث ننگ ہیں۔ ایسے ادیبوں کے لیے کروپا تکن کہتا ہے: ”کیا تم مصنف بننے کی آرزو رکھتے ہو؟ تو اپنے ملک کے مصائب کی داستان پر نظر ڈالو اور اگر اس کے بعد تمہارا دل خون نہیں ہو جاتا تو اپنے قلم کو پھینک دو۔ اس قلم کا مصرف صرف یہ ہے کہ تمہارے بیعتس دل کی ناپاکی کا پردہ قاش کرتا رہے؟“

گویا ادب آج کبیر داس کی زبان میں کہہ رہا ہے:

’کبیرا‘ کھڑا بازار میں لیے لکڑی ہاتھ جو گھر پھونکے آپنا چلے ہمارے ساتھ -  
 ہمیں ان لوگوں سے غرض نہیں جن کے دماغ روپیوں کے لیے  
 چکلا گھر بنے ہوئے ہیں اور جو سرمایہ دار پبلشروں اور جاہل و بے درد شہریوں  
 کے زر خرید غلام ہیں - ہمارا خطاب ان سے ہے جو تخلیق ادب کو رتبہ  
 پیغمبری دیتے ہیں - جو حق گو اور حق پوست ہیں اور جو سچ کہتے  
 ہوے کسی قسم کی پابندی سے نہیں ڈرتے -

اردو اور مذہب دو مختلف چیزیں ہیں - اردو اگر قومی زبان  
 بننا چاہتی ہے تو اسے ہر قسم کے خیالات و جذبات کا حامل بننا چاہیے -  
 وہ زبان ہرگز کسی ترقی یافتہ قوم کی زبان بننے کا استحقاق نہیں رکھتی  
 جس کے حسن و قبح کا فیصلہ کوئی مذہبی جماعت کرتی ہو - یعنی اردو  
 کے ادیبوں کو رواداری اور روشن خیالی کی تلقین کرنا چاہیے -

متوسط طبقے کی زندگی بند پانی کی موری ہے - عوام کو سمجھنے کی  
 کوشش کیجئے اور انہیں بتائیے کہ وہ اس خستہ حالی میں کیوں ہیں اور

کس طرح نجات حاصل کر سکتے ہیں —

اردو ادب کی زن پرستی دونوں جلسوں کے لیے باعث عار ہے۔ پردے کی سختی اور عورت کی کم یابی نے مرد کے نقطہ نگاہ کو پیکسر (Masochistic) (خود اذیتی) بنا دیا ہے۔ سجاد حسین اور مہدی حسن جیسے آزاد خیال ادیب بھی عورت کو شہوت رانی کا آلہ سمجھتے ہیں۔ جلسی مساوات کی تبلیغ ہی اس ناپاک ذہنیت کو دور کر سکتی ہے —

مولویوں اور بلذتوں کی زبان میں گتگو بلند کھیجیے۔ عربی و سنسکرت کو ان کے لیے اور انہیں عربی و سنسکرت کے لیے چھوڑ دیجیے۔ ادب کو فطری بنانے کے لیے ہندوستانی اسپرٹ ہی نہیں ہندوستانی صورت اور اسلوب بھی اختیار کھیجیے —

ادب جدید کے حامیوں کی انجمن بنائیے اور اس کے آرگن شایع کھیجیے تاکہ جدید خیالات کی اشاعت میں آسانی ہو اور قدامت پرستوں کے اعتراضات کا جواب دیا جاسکے —

ہر سیاسی اور سماجی انقلاب کے پہلے ایک ذہنی انقلاب کی ضرورت ہوتی ہے اور اگر ہندوستانی عوام ہر اعتبار سے ملکی جدوجہد سے الگ اور نا آشنا ہیں تو اس کی ذمہ داری ان کے تعلیم یافتہ طبقے پر ہے جو خود بھی اوہام و تعصب کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔ اب وہ وقت آگیا ہے کہ اردو کے ادیب بھی اپنے بلکالی اور ہندی معاصرین کے نقش قدم پر چلیں اور یہ ثابت کر دکھائیں کہ 'ادیب کا مشرب قومی و مذہبی تعصبات سے پاک ہے اور وہ واقعتاً انسانیت کا خادم' مصور اور پھشوا ہے —

سوچئے کہ انسانیت کے ماضی میں آپ کے لیے کون سے اشارات پلہاں ہیں، مسایل حال کھا ہیں اور مستقبل کی راہ کھا ہے۔ اپنے انداز بیان

کو ایسی جلا دیجیے کہ وہ ظلم کے لیے تلوار اور مظلوموں کے لیے  
بہداری کا شور بن جائے —

اور آپ کا مذہب کیا ہو؟ ٹھیکور سے بھی کسی نے یہ سوال کیا تھا اور اس  
کا جواب دہائے ادب کا جواب ہے! — ”مہرا مذہب وہ ہے جو ہر آرتست  
کا مذہب ہونا چاہیے۔ میں کسی ایک قوم یا مذہب یا ملک کا ترجمان  
نہیں ہوں۔ مہری زندگی بنی نوع انسان اور جملہ اقوام کے لیے اور مہرا  
پہغام ان کے ارتقا کے لیے ہے۔ مہری روح زندگی اور انسانیت کی وحدت  
میں کم ہوگئی ہے اور میں مذہبی، قومی و طبقاتی پابندیوں کو توڑ چکا ہوں“ —

اور آپ کا فرض کیا ہے؟ جو ہر انسان کا فرض ہونا چاہیے۔ کروپاتکن  
کے آگے بھی یہی سوال آیا تھا اور اس کا جواب ہر ایمان دار ادیب کا جواب  
ہے: ”اگر تمہیں اپنے دل و دماغ میں جوانی کی املگوں کا احساس ہونا  
ہے، اگر تم زندہ رہنا چاہتے ہو، اگر تم پاک و صاف، مکمل اور ارتقا  
پرور زندگی سے سرفراز ہونا چاہتے ہو — یعنی اگر تم ان حقیقی مسرتوں  
سے محظوظ ہونا چاہتے ہو جن کی تمنا ہر ذی حیات کرتا ہے — تو مضبوط  
بلو، عظمت و وقار کے زینوں پر چڑھو اور ہر کام مستقل مزاجی سے انجام دو —  
اپنے چاروں طرف زندگی کی تخم ریزی کرو۔ خبردار! اگر تم دھوکا  
دوگے، جہوت بولو گے، اور سازش کرو گے تو آپ اپنی نظروں میں ذلیل ہو  
جاؤ گے، تعریستی میں جاگرو گے اور تمہاری حالت اس غلام کی سی ہو  
جائے گی جو اپنے آقا کو ایذا ماننے لگتا ہے! اگر تمہارا رجحان طبع  
اسی طرف ہو تو یہی کرو لیکن اس حالت میں لوگ تمہیں کم زور، حقیر  
اور قابل نفرت سمجھنے لگیں گے اور تم سے ایسا ہی برتاؤ کریں گے۔ تمہاری  
طاقت کا کوئی ثبوت نہ پا کر عوام تمہیں قابل رحم سمجھیں گے — سو چو

رحم و کرم کے قابل ہو جانا انتہائی ذلت ہے۔ اگر خود اپنی صلاحیت کے بال و پر نوچتے ہو تو دنیا کو دشنام نہ دو۔ اس کے خلاف خود کو کمر بستہ کرو اور اگر کہیں تمہیں کوئی بے انصافی نظر آتی ہو خیراً اس کی نوعیت کسی قسم کی بھی کیوں نہ ہو — تو تم اس جبر و ظلم اور ناحق کے خلاف بغاوت کرو۔ جہاد کرو تاکہ ساری دنیا اطمینان کی زندگی بسر کر سکے۔ یقیناً جانو کہ اس لڑائی میں تمہیں جو روحانی مسرت حاصل ہوگی وہ اور کہیں نہیں مل سکتی —“



# ٹیگور کے ان بی مضامین

تاریخی ناول

(مترجمہ پنڈت ونشی دھر صاحب ودیا انکار)

انسانی معاشرے کا وہ بچپن کہاں گیا جب قدرتی واقعات اور مصنوعی انسانی خیالات بھائی بہنوں کی طرح ایک خاندان میں ایک ساتھ کھیلتے ہوئے بڑے ہوئے تھے۔ یہ کسی کے خواب و خیال میں بھی نہ تھا کہ ان واقعات و خیالات میں علیحدگی کی ایک بڑی خلیج حائل ہو جائے گی۔ کسی زمانے میں رامائن اور مہابھارت تاریخ کی حیثیت رکھتی تھیں لیکن موجودہ تاریخ انہیں اپنے زمرے میں شامل کرنے میں بہت پس و پیش کرتی ہے۔ وہ کہتی ہے کہ شاعری کے ساتھ تاریخ کا بھاء ہو جانے سے اس کا بلس مت گیا ہے۔ اب اس کے خاندان کو دوبارہ ابھارنا اتنا مشکل ہو گیا ہے کہ تاریخ شاعری ہی کی شکل میں اپنا تعارف کرانا چاہتی ہے۔ شاعری کہتی ہے ”بہن تاریخ! تمہارے اندر بھی بہت کچھ جھوت بہرا ہے اور مجھ میں بھی بہت سی سچائیاں ہیں اس لیے ہم دونوں پہلے کی طرح میل ملاپ کر لیں۔“ تاریخ کہتی ہے ”نہیں بہن، اپنے اپنے حصے تقسیم کر لینا ہی اچھا ہے۔“ علم کے امین \* نے ہر جگہ یہ تقسیمی

---

\* زمین کے حدود کے متعلق جھگڑوں اور دیوانی مقدمات کا فیصلہ کرنے والے سرکاری

مددہ داروں کو کہتے ہیں۔

کام شروع کر دیا ہے - حقیقت اور تخیل کی سلطنتوں میں حد بندی کے خطوط کھینچنے پر اس نے کمر باندھا ہے -

تاریخ کی حد عبور کرنے کے جرم میں تاریخی ناولوں کے خلاف جو اعتراضات کہے گئے ہیں ان سے ادبیات کا شہرازہ منتشر ہو رہا ہے - اس قسم کا اعتراض صرف ہمارے ہی ملک میں نہیں کیا گیا ہے ، صرف نوین بابو \* اور بلکم بابو ہی مجرم نہیں تھہراے گئے ہیں ، بلکہ تاریخی ناول نویسوں کا پیشوا اور امام اسکات بھی اس سے چھٹکارا نہ پاسکا - موجودہ انگریز مورخین میں فری مین صاحب کا نام بہت مشہور ہے - ناولوں میں تاریخ کی جو متنی پلید ہوتی ہے اس پر انہوں نے ناراضگی کا اظہار کیا ہے - وہ کہتے ہیں کہ صلیبی جنگوں کے بارے میں جو لوگ کچھ بھی جاننا چاہتے ہیں انہوں اسکات کا آٹون ہو ( Ivon hoe ) نہیں پڑھنا چاہیے -

بے شک ہمیں یورپ کی صلیبی جنگوں کے بارے میں حقیقت و آتمی کا علم حاصل کرنا چاہیے لیکن اسکات کے آٹون ہو میں ابدی انسانی معاشرے کی دوامی سچائی کا عکس دیکھنا بھی ہمارے لیے ضروری ہے - صرف یہی نہیں لیکن اس کے جاننے کی خواہش اتنی زبردست ہوتی ہے کہ یہ جانتے ہوئے بھی کہ صلیبی جنگوں کے متعلق اس میں بہت سی غلطیاں ہیں ، طلبہ ، پروفیسر فری مین سے چھپا کر آٹون ہو کے پڑھنے کی ترغیب کو نہیں روک سکتے -

اب قابل غور سوال یہ ہے کہ کیا سروالتر اسکات تاریخی واقعات اور

ادبیات کی حقیقت دونوں کا لحاظ رکھ کر آٹون ہو کو نہیں لکھ سکتے تھے ؟ -

وہ لکھ سکتے تھے یا نہیں اس کے متعلق قطعی طور پر کچھ کہنا تو

مشکل ہے لیکن اتنا ضرور کہا جاسکتا ہے کہ انہوں نے اس کتاب میں تاریخ اور ادبیات کا لحاظ نہیں رکھا۔

یہ ممکن تھا کہ انہوں نے جان بوجہ کر ایسا نہ کیا ہو، لیکن واقعہ یہ نہیں ہے۔ پروفیسر فری مین صلیبی جنگوں کے متعلق جس قدر جاننا تھا اسکا اتنا نہیں جانتا تھا۔ اسکاٹ کے زمانے میں واقعات کی تشریح اور تاریخی حقیقتوں پر غور و خوض کرنے کا طریقہ اس قدر ترقی پر نہیں تھا۔ مخالفین کہیں گے جب اسکاٹ لکھنے کے لیے بیٹھا تھا تو لازم تھا کہ اچھی طرح سوچ سمجھ کر لکھتا لیکن تحقیق کا یہ سلسلہ کب ختم ہوگا۔ ہم قطعی طور پر یہ کب جان سکیں گے کہ صلیبی جنگوں کے متعلق تمام معلومات حاصل ہو چکی ہیں، ہم یہ کس طرح جان سکیں گے کہ آج جسے ہم تاریخ کی اتل سچائی کہہ رہے ہیں کل نئے دلائل اس کے سر سے حقیقت کا تاج نہیں اتار لینگے؟ جو لوگ موجودہ مروجہ تاریخ کا سہارا لے کر تاریخی ناول لکھیں گے کل کے نئے مورخین اگر ان ناولوں کی بے قدری کریں تو ہم اس کا کیا جواب دیں گے؟

مخالفین کہیں گے کہ اسی لیے ہم کہتے ہیں کہ جتنا جی چاہے ناول لکھو لیکن تاریخی ناول مت لکھو۔ اگرچہ یہ خیال ہمارے ملک میں پیدا نہیں ہوا ہے لیکن انگریزی ادب میں اس کی بازگشت سنٹی دے رہی ہے۔ سو فرانسس پال گریو کہتے ہیں کہ تاریخی ناول ایک طرف تاریخ کا تو دوسرے طرف کہانی کا بھی بڑا دشمن ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ناول نویس کہانی کی خاطر تاریخ پر حملہ کرتے ہیں اور پراگندہ تاریخ کہانی کو خراب کر دیتی ہے۔ اس طرح کہانی کا سوال اور مینا و نون نیست و نابود ہو جاتے ہیں۔ اس قسم کے اعتراض کے باجود تاریخی شاعری اور ناول ادبیات میں کھوں

جگہ حاصل کرتے ہیں اس مضمون میں ہم اس کے اسباب کی وضاحت کریں گے۔ سانسکرت کی ادبی کتابوں میں شاعری ایک رس بھرے جملے کو قرار دیا گیا ہے۔ شاعری کے متعلق اس سے زیادہ مختصر اور وسیع المعنی تعریف ہم نے کہیں نہیں دیکھی۔ بے شک رس کی تعریف کو سمجھانے کا کوئی طریقہ نہیں ہے۔ جس شخص میں رس سے لطف اندوز ہونے کی صلاحیت ہے اس کے لیے رس کی تعریف بے معنی چیز ہے اور جس میں نہیں ہے اسے ان باتوں کے جاننے کی ضرورت ہی نہیں۔

انسکرت کی ادبیات میں اصلی رسوں کی نو قسمیں \* بیان کی گئی ہیں۔ لیکن بہت سے ناقابل بیان اور ملے ہوئے (م مرکب) رس بھی ہیں جنہیں بیان کرنے کی کوشش ہی نہیں کی گئی۔

انہیں متروک رسوں میں سے ایک کا نام ”تاریخی رس“ رکھا جاسکتا ہے اور یہ رزمیہ رس شاعری کی جان ہوتا ہے۔

کسی خاص شخص کا دکھ سکھ اس کی ذات کے لیے ہی کیا کم ہے۔ دنیا کے بڑے بڑے واقعات اس کے سامنے ساپے کی طرح نظر آتے ہیں۔ اگر اس طرح کسی خاص شخص یا اشخاص کی زندگی کے واقعات کے مدور جزر، عمل اور رد عمل ناول میں بیان کیے جائیں تو رس درجۂ کمال کو پہنچ جاتا ہے اور رس کا یہ جوش ہمارے دل پر گہری چوت کرتا ہے۔ ہم میں سے بہتوں کے رنج و راحت کا دائرہ محدود ہے۔ ہمارے جذبات

\* نو قسمیں یہ ہیں۔ (۱) شرنکار یعنی عشقیہ۔ (۲) ہاسیلا یعنی مضحک۔ (۳) کون احساس فم پیدا کرنے والا۔ (۴) دیر یعنی رزمیہ۔ (۵) رو در یعنی غصہ پیدا کرنے والا۔ (۶) بیہانک یعنی ڈارائنہ۔ (۷) بی بہتس یعنی نفرت انگیز۔ (۸) ات بہت حیرت انگیز۔ (۹) ڈانہ جس میں سکون ہو۔

کی گرمی چند رشتہ داروں اور احباب تک پہنچ کر ختم ہو جاتی ہے۔ وہں وردکش \* میں نکیندر، سوربہ مکھی اور کند نذنی کے عیش و کلفت اور رنج و راحت کو ہم اپنا ہی سمجھ سکتے ہیں کیونکہ ان تمام تکلیفوں اور راحتوں کا مرکز نکیندر کا خاندان ہے۔ نکیندر کو اپنا پڑوسی تصور کرنے میں ہمیں کوی طاقت نہیں ہوتی۔

لیکن دنیا میں بہت کم لوگ اس بام رفعت تک پہنچتے ہیں دکھ سکھ دنیا کے بڑے بڑے واقعات کے ساتھ وابستہ ہو جائیں۔ حکومتوں کا عروج و زوال، زمانے کے آئندہ واقعات کا سلسلہ، ان کی روز مرہ کی زندگی ہی کے کار نامے ہیں۔ ان کی کہانی جب گیت بن جاتی ہے تو رباب عالم اس کے سر کم تھیک کرتا ہے اور بجانے والے کی انگلیاں ہر تار میں ایک عجیب، پرسکون اور بہت دور تک پھیلنے والی مسلسل جھلکار کو بیدار کر دیتی ہیں۔

انسان کے ساتھ زمانے کی یہ رفتار ہمیں روزانہ دکھائی نہیں دیتی قوم کی تاریخ، کو بڈنے والا اس قسم کا کوئی بڑا آدمی اگر ہمارے سامنے موجود ہو تو بھی موجودہ مختصر زمانے میں وہ اور اس کے کار نامے دونوں اکتھے نظر نہیں آسکتے۔ اس لیے اس قسم کے لوگوں کو ہم انہیں کے زمانے میں تھیک طور پر نہیں دیکھ سکتے۔ انہیں اگر ہم ایک خاص شخص کی شکل میں نہیں بلکہ زمانے کے ایک جز کی شکل میں دیکھنا چاہیں تو ہمیں ان سے دور کھڑا ہونا پڑتا ہے، انہیں ماضی کے پس منظر میں رکھنا پڑتا ہے، وہ جس عظیم الشان نتیجے کے ہیرو تھے انہیں اور اس نتیجے کو ملا کر دیکھنا پڑتا ہے۔

ہمارا روزانہ کے دکھ سکھ سے دور ہو جانا یعنی جب ہم نوکری کر کے، روگا کر، کھا پی کر رقت گزار رہے ہوں اس وقت دنیا کے شارع عام پر جو بڑے بڑے رتھ بان دنیا کے رتھ کو چلاتے ہوئے جا رہے ہیں، چند لمحوں کے لیے ان کا خیال کر کے زندگی کے اس تنگ دائرے سے باہر نکل آنا، یہی حقیقی طور پر تاریخ سے لطف اندوز ہونا ہے۔

ایسا نہیں ہے کہ اس طرح کے قصے کامل طور پر تخیلی نہیں ہو سکتے لیکن جو قصے قدرتا ہم سے دور ہیں جو ہمارے علم سے بالا تر ہیں، انہیں کسی بہانے سے اگر ہم حقیقی واقعات کے ساتھ ملا دیں تو مصنفوں کے لیے، پڑھنے والوں کے دل میں اعتماد پیدا کرنا آسان ہو جاتا ہے۔ رس کی تخلیق ہی مقصد ہے۔ لہذا رس پیدا کرنے کے لیے تاریخی ذرائع کی جس قدر ضرورت ہوتی ہے شاعر ان سے کام لہنے میں کسی قسم کا پس و پیش نہیں کرتے۔

شیکسپیر کے انتلی اور کلیو پتیرا ڈراما کا جو مرکزی نقطہ ہے وہ دنیا کے لیے ایک آزمودہ اور روز مرہ کی جانی بوجہی حقیقت ہے۔ بہت سے غیر معروف، گمنام اور قابل اشخاص نے عورتوں کے مرہ لہنے والے جال میں پھنس کر دین و دنیا خراب کر لی ہے اور اس طرح کی چھوٹی چیزوں کے اہم بن جانے سے جو تباہ کن نتائج پیدا ہوتے ہیں ان کے حسرت ناک مناظر سے تاریخ بھری پڑی ہے۔

ہمارے روز مرہ کے دیکھے بھالے مرد اور عورت کی محبت کے زہر اور اموت بھرے کار ناموں کو شاعر نے ایک عظیم الشان تاریخی اسٹیج پر لاکر نہایت وسیع اور شان دار بنا دیا ہے۔ ذہن کے انقلاب کے بعد مسلک کا انقلاب شروع ہوتا ہے۔ محبت کی کش مکش کے ساتھ روم کے تمام لوگوں

میں پھوٹ ڈالنے والی زبردست جنگ کی تیاری ہوتی ہے۔ ایک طرف کیلو پیٹرا کے نشاط خانے میں فزل خوانی ہو رہی ہے اور دوسری طرف سنڈر کے کفارے طبل جنگ گونج رہا ہے۔ شاعر نے محبت اور احساسِ فم کے رس کے ساتھ تاریخِ کارس ملا دیا ہے۔ اس لیے اس ڈرامے میں دل کو ایک حیرت انگیز وسعت مل گئی ہے۔

مورخ مسن اگر شکسپیئر کے اس ڈرامے کو عالمانہ حوالوں کی روشنی میں دیکھے تو اس میں سپہو زمانی (Anachronism) اور تاریخ کی بہت سی غلطیاں نظر آسکتی ہیں۔ لیکن شکسپیئر نے پڑھنے والوں کے دلوں پر جو جادو کر دیا ہے، غلط اور بگڑی ہوئی تاریخ کے ذریعے جس تاریخی رس کی تخلیق کی ہے وہ جدید تاریخی تحقیقات کے باوجود بھی مت نہیں سکتا۔ اسی لیے ہم نے اس سے پہلے کسی تنقیدی مضمون میں لکھا تھا کہ ”ناول میں تاریخ کے مل جانے سے ایک خاص رس پیدا ہو جاتا ہے۔ ناول نویس صرف اسی تاریخی رس کے حریص ہوتے ہیں۔ تاریخی حقیقت کی انہیں کوئی خاص پروا نہیں ہوتی۔ اگر کوئی شخص ناول میں تاریخی رنگ و بو سے مطمئن نہ ہو اور اس میں سے پورے تاریخی اجزا کو نکالنے لگے تو یہ گویا سالن میں زیرہ، ہادی، دھنیا اور سرسوں کی تلاش کے مصداق ہے۔ مسالے کو ملا کر چولوگ سالن کو لڈیڈ بنا سکتے ہیں وہ بٹائیں اور جو اسے پیس کر سالن میں ڈالتے ہیں ان سے بھی ہمیں بحث نہیں کیونکہ یہاں صرف مزے سے غرض ہے مسالا تو اس کا ایک ذریعہ ہے۔ یعنی ناول نویس اگر تاریخ کو جوں کا توں رکھ کر ناول لکھیں یا اس کے اجزا ملا کر تاریخی رس پیدا کر سکیں تو انہیں اپنے مقصد میں کامیاب سمجھنا چاہیے۔ اس لیے اگر کوئی رام چندر کو ادنیٰ اور راون کو اعلیٰ حیثیت

میں پیش کرے تو کیا کوئی جرم نہ ہوگا؟ ضرور ہوگا۔ لیکن وہ جرم بلحاظ تاریخ نہیں بلکہ بلحاظ شاعری ہوگا۔ مقبول عام حقیقت کو ایک دم پلٹ دینے سے رس کا مزا جاتا رہتا ہے۔ گویا مطالعہ کرنے والوں کے سر پر ضرب سی لگتی ہے اور اس سے شاعری چست ہو کر گر پڑتی ہے۔

یہی نہیں! اگر کسی جھوٹی بات کو بھی مدت سے عام لوگ سچ ماننے چلے آ رہے ہوں اور اگر تاریخ اور سچائی کے لیے شاعری اس کے خلاف احتجاج کرے تو یہ شاعری کا جرم ہوگا۔ تصور کھینچے کہ اگر آج بنگلہ کی شبہ کے یہ ثابت ہو جائے کہ شرابی اور بے اصول یادوں کا خاندان یونانی قوم میں سے تھا اور سری کرشن بنوں میں آزادی سے گھومنے والا اور بانسری بجانے والا یونانی قوم کا ایک گوالا تھا، اگر یہ ثابت ہو جائے کہ اس کا رنگ اس کے بڑے بھائی بلدیو کے رنگ کی طرح گورا تھا، اگر یہ ثابت ہو جائے کہ جلا وطن ارجن ایشیا کے کوچک کی کسی یونانی حکومت سے یونانی شہزادی سو بیدرا کو چیت لایا تھا اور دوار کا سمندر کے کنارے ایک چھوٹا سا جزیرہ تھا، اگر یہ ثابت ہو جائے کہ جلا وطنی کے وقت پانڈروں نے فن جنگ کے ماہر عالی دماغ یونانی بہادر کرشن کی مدد سے اپنی حکومت دوبارہ حاصل کر لی تھی اور اس کی باکمال غیر قومی سیاست، جنگی مہارت اور ایسے مذہب کا علم جس میں عمل کی بڑی اہمیت تھی ان خصوصیات سے حیران ہو کر ہندوستان نے اسے اوتار مان لیا تھا، تو بھی ویدویاس کی مہا بھارت نہیں مت سکتی اور کوئی نیا شاعر جرأت کر کے کالے کو گورا نہیں بنا سکتا۔

ہم نے یہ باتیں سرسری طور پر کہی ہیں۔ نوین بابو اور بلکم بابو

اپنی شاعری کی کتابوں اور ناولوں میں مروجہ تاریخ کے خلاف اتنی دور

جا پڑے ہیں یا نہیں جس سے شاعری کا رس جاتا رہا ہے، اس کا اندازہ ان کے گزرتوں کی خاص تنقید کے وقت ہی کیا جاسکتا ہے۔

اس حالت میں ہمارا کیا فرض ہے؟ ہمیں تاریخ پڑھنی چاہیے یا آٹون ہو؟ اس کا جواب بہت آسان ہے۔ دونوں پڑھنے چاہئیں۔ حقیقت کے لیے تاریخ پڑھنی چاہیے اور لطف کے لیے آٹون ہو۔ کہیں ہم غلطیوں ہی کا علم نہ حاصل کر لیں، اس خدشہ سے جو شخص شاعری کا لطف نہ اٹھائے گا اس میں شے لطف کی کمی آجائے گی۔

شاعری میں جو تاریخی غلطیاں ہمیں نظر آئیں گی ہم انہیں تاریخ میں درست کر لیں گے لیکن جو شخص صرف شاعری کی کتاب پڑھے گا اور تاریخ پڑھنے کا موقع نہ پائے گا وہ بد نصیب ہے اور جو شخص صرف تاریخ ہی پڑھے گا اور 'سے شاعری کے مطالعے کا موقع نہ ملے گا غالباً یہ شخص پہلے سے بھی زیادہ بد نصیب ہے۔



# سخنوران ایران در عصر حاضر

از

( از جناب آغا محمد تقی "پارسا" شیرازی پرونیسرادرنک آباد کالج )

جذبیدن ادیبانه و مسافرت دانشمندان جذاب آقا ... محمد اسحاق

نوید زندگی بخشی میدهد و آلوده بسیار درخشانی را بمانزدیک میکند - کم کم ذوق و شوق علمی و تشنگی و اشتیاقی صادق در مشرق پیدا می شود - آهسته آهسته حاسه دانش پژوهی و چشم بصیرت مشرقیان بیدار گشته رفته رفته احساس حقیقت جوئی و عاطفه تحقیق طلبی آنان را تکان داده بجنبش انداخته است از به راهت تقلید بیرون آمده بشاهراه تحقیق افتاده اند - این بهترین نشان درخشان و علامت نمایان بیداری مشرقیان است -

راز ترقی اروپا

ترقی اروپا از یک نقطه بسیار مهمی آغاز گشته و رفته رفته بزرگ گردیده و بالاخره به تمام شدن زندگی محسوط شده است — اروپا در همین ملت آن اشخاص باهمت و حوصله مدد است که با پائیموردی زحمت در شاهراه تحقیق و انکشاف افتاده اند و پافشاری نموده هر چیز را در جا و محل آن تحقیق و انکشاف کرده اند ، کیمیا و طبیعیات را در عالم تجزیه و مشاهده و تجربه ، جغرافیا را در بحری را در دریا و بری را

در کوه و صحرا، زبان بهگانگان را در وطن آنان و همچنین هر چیز را از راه خود آن و درجا و مرکزش تحصیل و تحقیق کرده اند - سپس باهوش کافی و موشکافی آن راه مرتب ساخته اشاعت داده اند و در نمایش گاه عالم عملی گزارده اند -

پایه بلند ایران شناس بزرگ و معروف استاد ادورد برون مرحوم (Edward Brown) نیاز مند معرفی نمی باشد - این استاد بزرگوار برای تحقیقات ادبیات زبان فارسی از انگلستان رهسپار ایران گردیده - کوه و بیابان را در نوردیده رو بمركز نموده داخل محیط ادبیات زنده شده است - جلوس ادباء، انیس شعرا، هم نشین خاص و عام گشته - وضع مملکت را مطالعه کرده - با روح ادبی، احساسات شعری، عواطف ملی، آداب و اخلاق و نفسیات ایرانیان آشنا شده - نه تنها ایران شناس شده بلکه متعلق به آداب ایرانیان گشته، محفل آرا، مهمان نواز، ایران پرست گردیده - پس قدم در جاده ادب گذاشته و قلم تحقیق را بصحرکت آورده است - همیشه و هر جا از خامه و زبان او روح، عواطف، احساسات ایرانی تراوش میکند و با این حال تاریخ ادبیات ایران نوشته است - این است رفتار یک محقق اروپائی که از راه دور و دراز با وجود بیگانگی ادبی و اخلاقی و زبانی رو بایران میکند -

حال می رویم بر سر مطالب - اردو زبان، مشرقی، همسایه ایران، که یگانگی ادبی، اخلاقی با فارسی زبانان دارد، و روح ادبیات هر دو یکی است، باید برای تحقیقات ادبیات فارسی توجه مرکز کرده خود داخل محیط ادبیات زنده شود، و خود برای تحقیق ادبیات شاهراه نزدیکی کشف کند، نه که مانند مقلدین کمراه شده راه دور و دراز پیش گرفته

خود را گول زده و دیگران را هم فریب دهد -

بنا برین مسافرت جناب محکمہ استقامت و تالیف کتاب "سخن و روان

عصر حاضر" آئینہ درخشانی را بما نزدیک میکند -

سرپرستی ہندوستان از فارسی گزشتہ درخشانی را تربیت و پرورش

داده است - آقا سعید نفیسی تاریخ و تذکرہ ادباء و شعراء فارسی زبانان

ہند را تالیف کرده اند و بسیار پسندیدہ است - سلسلہ ادبی ہندوستان

و ایران گسیخته شد و مسئولیت ہندوستان دو چند شد (انگریزی، اردو)

مگر تعلقات اردو و فارسی بحال خود باقی ماند ، و ہندوستان مستقیم

و غیر مستقیم باز از فارسی سرپرستی کردہ دست از نواز شہای ادبی

نکشید - باز در ہمین قرن جدائی دست و زبان ادب پژوہان ہندوستان

ادب و زبان فارسی را در ہند زندہ نگاہ داشته است - و فقط تاریخ ہمین

قرن دربارہ ادبیات و زبان فارسی در ہندوستان محتاج نگارش رسالہ

جداگانہ است - و این جا فقط بہ سہ خدمت بزرگ اشارہ می شود -

( ۱ ) شعرالعجم - از علامہ بزرگ مرحوم شبلی نعمانی این اعجاز

دہر در شعر عجم شناسی یکتا و بے مانند است در پنج جلد تاریخ

ادبیات شعری فارسی تصنیف نمودہ و با کمال استادی و نکتہ سلجی

تاریخ روحی و شعری شعراء را توضیح و تشریح نمودہ و عظمت روح

شعری فردوسی و سعدی و حافظ را در نمائش گاہ عالم ادبیات بے

پردہ کردہ است و بہ روانِ قدما و متوسطین و متاخرین ترو تازگی

بے اندازہ بخشیدہ است -

( ۲ ) جناب دکتر اقبال کہ بازبان فارسی مقاصد حکیمانہ خود را سرودہ اند

و در عالم ادبیات یک فلسفہ جدیدی اضافہ نمودہ اند - چون ایشان

در فلسفہ مغرب نیز استادند و با ذوق شمیری اروپائی آشنا فوق العادہ اشعار ایشان تجدد معلوی و فکری دارد، و زبان فارسی را آئینہ تفکرات جدید خود قرار داده اند، افکار ابتکار ایشان کہ در زبان فارسی سرودہ اند شہر تہن بارو پاہم رسودہ و از زبان فارسی بزبان خارجه ترجمہ شدہ است -

(۳) "سخن و زبان عصر حاضر" است کہ موضوع این تبصرہ است

قدر و قیمت سخن و زبان عصر حاضر

تعلقات اردو بہ فارسی

فارسی با شاہشاہی مسلمانان بہ ہند در آمدہ باہم فرمان فرمائی می کردند - سرانجام سلطنت مسلمانان رو بزوال نہادہ فارسی پائنداری کردہ بہ شکل و قالب دیگر در آمدہ و نام نوی بخود گرفت - یعنی روح فارسی با تمام مجلی ( ترکیبات ، تشبیہات ، استعارات و غیرہا ) در قالب تازہ حلول کردہ با اسم اردو باز دست از فرمان فرمائی نکشید - امروزہ متیوان گفت در ہندوستان ، ہیچ زبانے مانند اردو عبومیت ندارد و شمارہ اردو دانان ( ہنوک و مسلمانان و اردو پائیان ) از تمام زبانہاے بومی و بیگانہ بیشتر است از کابل گرفتہ تا مدللہ ( Mandalay ) زبان اردو آلت تبادلہ خیالات اقوام گوناگون است - بلکہ بہ ساحلہاے دور دست نیز دست اندازی کردہ است در بیرون ہند زبان این مملکت را ہمیں زبان اردو مہدانند و بس - از زبان ہندی و ہندوستانی تہہ اردو میخو اہند در جاہاے کہ براے کار و بار تدریس زبان این مملکت مہد ہند همان اردو است - کسی بخو اہد یا نخواستہ بداند یاندا ند ، کشور پهن و دراز ہند مہدان و جولانگاہ اردو است - و آن زبان بومی کہ ادعاے مقابلگی با اردو می کند دائرہ مختصر تلگی دارد - اردو یک زبان عجیبی است شاید نظیر نہ داشتنہ باشد - مدارج ارتقاء خود را

در کنترین وقت طے کرده، و خزائن ادبیات خود را مخصوصاً نظم، زود معمور و آباد نموده است - نشرو زبان علمی نهر بسرعت شگفت انگیزی دارد خود را بسر منزل خویش نزدیک می کند - اگرچه اردو هندی الوطن است و شمائل آن شباهت ظاهری تامی بزبان هندی دارد مگر روح آن و حرکات و سکنات از فارسی است، و روح فارسی باتمام علمی و جمیع خصوصیات در آن حلول کرده است - اگر اردو بخواهد قطع بستگی خود از فارسی بنماید اولاً خزائن ادبیات خود را بدست خویش آتش میزند ثانیاً باید بطور قهقری برگشته در عالم نشوونمایی طفولیت در آید و این خلاف قانون فطرت است - به فرض محال در آن حال نه ادبیات نه نظم و نه لغت می ماند و اردو مفلس محض می شود - سخن کوتاه از اردو تنها یک نام باقی می ماند - نام هم (اردو) از بیرون آمده کشتنی است یا باید تبعید (شهر بدر) شود - اردو یادگار عهد زرین اتحاد مسلمانان و هندو است - روح و خیال از مسلمانان و ساخت جسم از هندی است -

بنابراین اطلاع از ادبیات عصر حاضر برآوردارای اهمیت است هر دو دوره تکامل را دارند طے می کنند - هر دو اشتراک روحی دارند - بالآخره تجدیدات فارسی را باید بغور مطالعه کرد - هر چه برآوردو مفید است باید اختیار نمود و هر چه زیان بخش است پرهیز از آن لازم است - مسافرت دانشمند محترم آقا محمد استحاق دارای اهمیت است -

'اول' محققانه براه راست افتاده در محیط ادبیات زنده رفته اند -

'دوم' تنها ذوق علمی، شوق مشاهده، حس حقیقت جوئی محرک این سفر است -

'سوم' سفر نتیجه تحقیقی خود داده و سه جلد بزرگ ادبیات عصر حاضر

فراهم و جمع آوری کرده اند -

چہارم، ایمان اول محققى است کہ ادبیات زبان حال را محققانند در ایران جمع کرده و هندوستان و ممالک دنیا را بآن آشنا می کند -

آرژو، چہار جلد تاریخ ادبیات ایران تالیف استاد بزرگ مرحوم ادورد برون (Edward Brown) بگوش ادب پژوهان رسیده و بیشتر آن را خوانده اند - استاد مرحوم از آنجا کہ دست رس تحقیقی بوده آغاز کرده، وہ بزمان حاضر خاتمه میدهد و زندگی مرحوم همین جا انجام یافت - ادبیات زبان حاضر منتظر استاد و محقق دیگر بود - در واقع این سه جلد ادبیات عصر حاضر متمم و مکمل چہار کتاب استاد برون مرحوم است - لکن این چہار جلد تاریخ ادبیات است و سه جلد عصر حاضر ادبیات است و تاریخ و تذکره مختصر و منہدی ہم دارد - امید است آئندہ جنبه تاریخی بیشتری پیدا کند -

کتاب "سخنوران عصر حاضر" دارای سه جلد است - جلد اول طبع و مجلد شده زیر مطالعه نگارنده است - جلد دوم زیر طبع است - و این هر دو در ادبیات شعری است - و جلد سوم فقط ادبیات نثری است - هر سه جلد (نظم و نثر) ادبیات عصر حاضر است یعنی دوره مشروطه (از سال ۱۲۲۵ عدل مظفری) لکن تاہر سه جلد ملاحظہ نشود آغاز حقیقی این ادبیات نمی توان نوشت - تبصره و انتقاد کامل ہم بعد از مطالعه سه جلد ممکن است - کثرت تلہا تبصره مختصری در باره جلد اول کہ مطالعه شده است ذیل نگاشته می شود -

(۱) کاغذ، طبع، خط، عکس، جلد بلندی آبرو مندانه است - و این نیزیکه از علامتہای نمایان بیداری مشرق است - کارکنان مطبعه جامعه ملیہ دہلی مستحق تحسین و آفرین هستند - کتاب با سلیقہ خوب و اسلوب مرفوب مراحل زیبایی را طے کرده و بتحد کمال رسیده است -

(۲) ادرائی تقریظی است از استاد معظم جناب جمال زاده و ایشان با چشم حقیقت شناس اظهار حقائق کرده اند —

(۳) دیباچہ خود جناب محمد اسحاق است کہ نظریات محققانہ خود را مفید و مختصر بیان نموده اند —

(۴) انتخاب قسمت اول از اشعار 'سخنورانِ عصر حاضر' کہ موضوع حقیقی این تبصرہ است کلون تبصرہٴ مختصری نوشته و انعقادِ سرسری نموده قدر و قیمتِ ادبی کتاب به نظرِ ادب پڑدهان می رساند —

### حسن انتخاب

نگارندهٴ ایرانی، مسلم، هر از دو سه سال یک دفعه تجدید عهد کرده در هسپانِ ایران شده و در شهرها و ایالات گردش نموده است و چندین بار در طهران قریب دو سال توقف داشته است و با بعضی شعرا آشنا، و با اشعار عصر حاضر یا خبر - و خود در همین دوره نشو و نما یافته است - نگارندهٴ انتخاب را دیده خوبی و زیبایی آن تعجب خیز و طرب انگیز است - تعجب خیز است کہ چگونه یک نو وارد توانسته است با صدها ادبا و شعرا آمیزش کند و عالم ادبیات آنان را چنانکما نظر محققانہ خود نموده و نقشہٴ روحی ایشان را با مشقتها برداشته باین ارزانی در عالم ادبیات نمائش دهد - ازین جهت طرب انگیز است کہ بعد از ملاحظه و مطالعهٴ کتاب روشن می شود کہ محقق با وجدان و طبع سلیم و در حسن انتخابات به احسن وجوه کامیاب است - و اسبابِ کامیابی را همه آماده کرده اند —

اول جناب ملتخب در فارسی متبحر، دوم در دارالفنون کلکته استاد بزرگ فارسی، سوم متحرک ذوق علمی و اشتهاے صادق است، چهارم توجه بخود ایران کردن، پنجم مشرقی و اردو زبان، ششم اشتراک اخلاقی و

ادبی، ہفتم ندیدہ باید گفت با اخلاق عالمانہ مورد توجہ عموم ادباء شدہ ،  
و بواسطہ اشتہارے صادق شہانہ روز رنج کشیدہ و آرام را بر خورد حرام کردہ  
اند۔ تہا یک حسِ حقیقت طلبی بر وجود ایشان فرمان فرما بودہ است۔  
قدر و قیمت ادبی کتاب

انقلابات سیاسی، آزادی، فکری، تجدیدی، اخلاقی، تمدنی، اجتماعی،  
نہ از کتاب تا اندازہ میتوان بدست آورد۔ و بالاتر از ہمہ درجہ انقلاب  
و تغیرات ادبی میتوان کشف کرد و دانست و فہمید کہ ادبیات فارسی  
راہ مشی خود را تغیر دادہ است و از عالم تلک و تاریک بیرون آمدہ  
در جہان روشن و گشادہ یا گزاشتہ است و کم کم دارد خورد را بہ سر منزل  
آیندہ خویش نزدیک می نماید۔ امید است بعد کمال رسیدہ در فضاے  
علمی یک ملت ہم آہنگ و یک تودہ یک نواخت بار آورد۔  
انقلابات و تغیرات زبان فارسی (زبان شعری)

یک جہتی و یک نوائی و عمومیت زبان است۔ و این وجہ داراے  
اہمیت فوق العادہ است و باید با نظر عمیق آنرا نگریستہ در اطراف آن  
سخن سرائی کرد۔ پیش ازین دورہ زبان فارسی اسیر دستہ بلندی و گرفتار  
پنجہ ادباء و شعرا بود و طبقہ شعرا صاحب امتیاز و فعال مایشاء بودند۔  
علمائے دین را مذہبی، شعرا را شعاری، منشیہارا شیوہ و ادباء را دابی،  
دولتہان را تسلطی خاصی بود۔ عوام یک جادہ سادہ و راہی ہموار و روشی  
طبیعی خدا دادی داشتند۔ زبان ہم مانند مذہب سر و کارش بہ دستہ بلندی  
کشیدہ بود۔ نشیب و فراز، پستی و بلندی زبان بہ نظر خوانندگان رسید۔  
در زمان محمّد شاہ (۱۲۵۰ تا ۱۲۶۲) بدستہاری چلک نویسدہ بزرگ تا اندازہ  
خوبی زبان ہموار و یک رخہ گردیدہ بود بہ پائہرہی "قائم مقام" و "فاضل خان

کروسی“ وچند استناد دیگر سادہ نویسی و مطلب نگاری بروے کار آمدہ بود۔ و بہ کاستنِ برگ و شاخ انبوه باغ سخن آرائی تروتاز گئی نوی یافت۔ و این روش پیش رفت کردہ در آغاز (۱۲۹۲ھ) ناصرالدین شاہ وزارت مہرزا تقی خان یک دفعہ جنبش خود را تیز نمود۔ اصطلاحات ملکی مہرزا تقی خان، افتتاح دارالفنون (کالج)، آشنائی بافرنگ، شناسائی زبان فرانسه، ہمہ دست بہم دادہ راہِ تغیرات و ترقیات وسیع شد۔ افسوس باز ہم افسوس کشتہ شدن مرحوم مہرزا تقی خان، چرخ ترقیات را از کار انداخت و حرکت ادبی نیز سست گردید۔ خلاصہ این مطلب از موضوع بحث بیرون است۔ مقصود این بود کہ یاد آوری شود کہ ادب جدید دورہ مشروطہ دفعتاً و ناگہانی پیدا نہ شدہ است عوام در ہر چیز خوف زدہ شدہ اند و از چہار جہت خواص بر ذہن سادہ عوام حملہ می کردند۔ (۱) از چہتے دور باش شاطران استبداد۔ (۲) از جانبیے کور شو علم برداران شریعت۔ (۳) از سمتی قلبہ گوئی ادیبان۔ (۴) از طرفے مشکل تراشی شاعران، ناچار طبیعت عوام کند و ذہن شان کور شدہ بود۔ بہ شنیدن و نہ فہمیدن و خواندن و نہ سنجیدن عادت کردہ بودند بہترین تعریف عوام براے واعظ آن بود، سبحان اللہ خیلے عالم است، کسی حرفش نمی فہمد۔ این حرف را با سادگی براے بزرگواری واعظ می زہند در واقع درست می گفتند۔ واعظ خودش ہم کلام خویش نمی فہمید گویا نافہمی ہم مانند فہم محتاج استناد است و نادانی ہم مثل دانائی از بزرگ بکوچک مہرسد۔ در حقیقت چنین است عوام حق دارند رفع تہمت از خود نمودہ در مقام مدافعہ بر آمدہ بگویند۔ درست است نافہمی و نادانی بیماری است و متعدی می باشد مگر از بزرگ بکوچک رسیدہ، از بالا بہاٹین آمدہ است، عرض خاص است لکن مرض عام شدہ، آب از سرچشمہ گیل آلود است۔

برائے استقلالِ مملکت و جزوِ عوام لازم شد لہذا شعراءِ بوزبانِ ایشان و برائے ایشان اشعارِ ملی و مصائبِ مملکتی سرودن گرفتند - هیچ مملکتی بدون پشتبانیء اکثریت بمقصد نمی رسد و در واقع اکثریت مالکِ ملک است و اکثریت ہمیشہ زندہ است و زبانِ اکثریت زبانی است کہ قابلِ بقا و ارتقا است - پس باید اولاً زبان را یک جهت ساخت و همزبان با عوام شد بعد شروع بمقصد نمود - ادباء، خطباء، شعراءِ ایران مطلب را درک نموده با عوام یک جهت و همزبان شدند - و همزبانی اثرِ خود را کاملاً بخشید و ملتِ جاہل نادان و پے خبر بہ جنبش افتاد - در مملکت شعری، ملتِ حساس شعرهاے ملی را وردِ خود ساخت، ذوقِ شعریِ آن قوی شد و اشعارِ قلوبِ آنها را مستخر کرد -

اشعارِ عشقی، عرفی، ایرج میرزا، سید اشرف الدین، مانند برقِ زبانِ زدِ عام و خاص گردید - تمجب اینجا است کہ بہمان درجہ کہ خواص ازین اشعار متاثر می شوند و چند درجہ بیشتر عوام متالم می گردند و می فہمند این گونه اشعار بایک لہجہٴ نمکین و زبانِ سادہ احتیاجاتِ ملی، مصائبِ مملکتی را با احساساتِ ملی و عواطفِ قومی ذہن نشینِ عوام می کند و این بزرگ ترین مدرسہ است -

طلوعِ مشروطہ و آزادی، پیش آمد یک مقصودِ عمومی، مصائبِ ملی، احساسِ احتیاجاتِ مملکتی، ملتِ ایران را با ہم متحد کردہ ہم زبان ساخت و زبانِ فارسی بایک سرعتِ شگفت انگیزی گریبانِ خود را از دست تفرقہ بہرون آوردہ در شاہراہِ یک چہتی افتاد - امید است آیلدہ یک فضائے علمی، یک محیطِ ہموار، یک ملتِ یک ساختی را بار آورد - طلوعِ مشروطہ زبانِ را آزاد و قلم را توانا ساخت - پیش آمدن یک مقصودِ عمومی نویسنده و

گویندہ را بسیار کرد - مصائب ملی خوانندہ و شہزادہ را فراوان نمود - احساس احتیاجات مملکتی مشی زبان را تغیر داد و شعرا از مقام خدائی خود پائین آمده ہمزبانِ عوام شدند - مراعات ذہن آنها نمودہ بفہم ایشان شعر سرودند - ادیبان و گویندگان سخنان خود را عوامانہ ادا نمودند کم کم الفاظ عامیانہ و بازاری راہ و رخنہ یافتہ زبان زد ادبار شعرا شدہ زبان را سادہ و شیرین تر گردانید - عوام نیز باشوق و ذوق نزدیک آمدہ و برائے مطلب فہمی آمادہ شدند و از عالم تلگ و تاریک بپوختری بیرون آمدہ بہ دنیائی نوی داخل گشتند - اشعار وطنی ، سرودہائے ملی بہترین معلم ایشان شد ایشان را سرگرم و پرجوش ساختہ ہنگامہ انقلاب را گرم کردند - برائے آزادی و آبادی نعرہ " زندہ باد انقلاب " از جگر برکشیدہ و مستحضرِ عام و محشر ملی برپا شد - با پشت کاریِ خواص و پشتبانیِ عوام کاخ استبداد سرنگون گردیدہ سلطنت ملی شد -

#### وطنیات

ادبیاتِ شعریِ فارسی پیش از مشروطہ یک دنیای پہناور و مستازی است و پہناوریِ آن زیادہ تر از درازی است - یعنی موضوع کوتاہ ، مضمون کم و بد بختانہ مکرر است بعبارت دیگر مضمون و موضوع کم و شاعر بسیار - از اینجا است کہ یک موضوع کوچک خسرو شیرین ، لیلی مجنون ، فرہاد شہرین ، یوسف و زلیخا ، میدان مقابلہ و مبارزہ شعرا است و شعراء بزرگ برائے یک موضوع کوچک بجان ہم افتادہ اند گویا عالم خیال ہم مثل عالم معیشت تلگ شدہ و میدان نوازہ المبقا پہن آمدہ است لکن در حقیقت مسئلہ نوازہ للمبقا فقط برائے نان نیست اگر ہمت برائے جان است و جان شعری بالاتر از جان نانی است - بد بختانہ بیشتر شعراء ایران برائے نان شعر می

گفتند و ہر دو مہدیان برائے آنان تلگ بود - تمام افراد بلی آدم برائے نان جان می دهند - آدم برائے نان خام (گندم) دست از نعمتہائے بہشت کشید - اگر اولاد او بوائے گندم پختہ (نان) بجان یکدیگر بیفتند جا دارد - سخن کوتاہ ، مضمون محدود ، استاد محدود ، نابغہ کیاب ، شاعر بسہار ، دائرۃ شعر وسیع تعریف شاعری ازان وسیع تر است و کشور شعر حد و کفارہ ندارد - آزادی و صلے عام است -

ہر کہ خواہد گو بہا و ہر کہ خواہد گو برو

گیر و دار و حاجب و دربان درین درگاہ نیست

بلی ولی استاد کم است و نابغہ نادر نہ تنها در دنیائے شعر بلکہ در ہر چیز و ہر جا ہمیشہ نابغہ کیاب است - گویا روزگار درین بارہ امساک و بتخل کردہ است فقط وضع جغرافیائی سبب کیابی شعراء بزرگ نیست بلکہ سبب اصلی قذاعت و کفایت شاعری طبیعت است - فقط چند استاد بزرگ نابغہ دنیائے ادبیات پیش از مشروطہ شدند و ہمین چند تن نابغہ کشور ادبیات را فتح کردہ اند و ہمہ مستحق تکریم و احترام هستند - و دیگران ہم در مرتبہ خود خدمت کردہ اند و مستحق تعریف می باشند - درین جا فقط دو نابغہ بزرگ ذکر می شود -

فردوسی نہ تنها نابغہ ادبیات است بلکہ بواسطہ ایجاد موضوع مہم و مفیدی ، دارائے مقام بلندی است - این نابغہ نادرہ ، بقاء ملت ، زبان ، آداب و رسوم ملی ، تاریخ مختصراً ہر چیز ملی و وطنی را در نظر گرفته پس یک عمر جانکاہی نہودہ و سراپا خدمت بہ ابدائے وطن کردہ است و ملت ایران را از پامالی و تباہی نجات دادہ است - سعدی نیز تنها نابغہ شعری نیست بلکہ بایک طرز بلیغ و یک اسلوب شیوا اصلاحات ملی را

پوش نهاد خود نموده است و بادشاه و وزیر، رنک و زاهد، جوان و پیر، توانگر و فقیر، تعلیم و تربیت، اخلاق، ظلم و عدل، عشق و جوانی، ضعف و پیری، عواطف، احساسات، مختصراً احوال ملی را در نظر گرفته با یک فصاحت ساده و بسیار مختصر موثری در پئے اصلاح برآمده است و توجه خاص و عام را بخود معطوف داشته - ایجاد این گونه موضوع در وقت ضرورت از مختصات سعدی بوده و حقیقتاً او مصلح است - وضع جغرافیائی ایران و آب و هوا، باغها، گلها و گلستانها، و انقلابات سیاسی همیشه شاعر پیدا کرده است لکن مخاطب دلیل منطقی می خواهد - در همین زمان حاضر باند زه ماخذ درست بدست آمده است که میتوان یک کتابچه نوشت بلکه گواه تاریخی از زمان هخامنشی بدست داریم تقریباً ۳۴۰۰ پیش از میلاد عیسی - از روئی ادله تاریخی شعر قبل از اسلام در ایران موجود بوده است لکن یک نکته مهمی دیگر هم ایرانیان قدیم در شعر ملحوظ می داشته اند و آن توافق اوزان شعری با موسیقی ملی است - این رعایت درین عصر حاضر کم کم دارد لحاظ می شود - امید است آینده وسیع شده اثرات مسرت انگیزی بدهد - آن هم یکی از شاه کارهائے عصر حاضر است که زبان را عمومی و یک جهت می کند و روح عوام را تکان داده آنان را برائے مبارزه زندگانی ملی آماده می نماید - اشعار جدید به سبب هم آهنگی با موسیقی در خانه و کوچه و بازار و محافل ادب و بزم عیش قلوب عامه را جذب کرده است -

طلوع مشروطه و پهن آمدن یک مقصود عمومی، احساس احتیاجات و طلبی، مصائب مملکتی هزارها موضوع منهد بدست شعراء می دهد

ویک کشور وسیع بزرگی باسم ایران ، وطن به آنها حوالہ می کند -  
 کلون موضوع بسیار مضمون بے شمار است - ازینجا است کہ شعار این  
 عصر همه وطنی شده است - قصیده ، غزل ، قطعہ ، ترجیع بدی ، رباعی ،  
 اوزان جدیدہ ہر کدام در یک موضوع مہمی ، یک مضمون مفہومی  
 سرودہ شدہ است - از پیور ہشتاد سالہ ( ادیب پشاور ) تا جوان نو خیز  
 ( حسام زادہ ) ہمہ بایک گرمی حقیقی و وطن و ابتداء آن را در نظر دارند  
 و ہمہ موضوع تازه و مضمون نو ایجاد می کنند - سخن کوتاہ کلون شاعر  
 کم و مضمون بسیار است -

سہل شعر گوئی با جوش و خروش سرازیر شدہ است و راہ ہائے نوپوش  
 گرفتہ جو پائی مجبر ہائے طبیعی است و کلون مضمون بے حد ، موضوع بے انتہا ،  
 بز شاعر بسیار ، استناد کم و چہان ادب تشلہ وجود نابغہ است -  
 جلد دوم و سوم ، سخن و دان عصر حاضر ، بہ نظر نرسیدہ است و نگارندہ  
 ناچار است در حدود جلد اول تبصرہ بدویرسی بدنا برین کلون فہرست مہمی از  
 انقلابات ادبی نوشتہ مقالہ ختم می شود -

#### انقلاب ادبی زبان فارسی

- ( ۱ ) یک رخی و یک چہتی زبان -
- ( ۲ ) وطنی شدن عالم نظم -
- ( ۳ ) توافق با موسیقی -
- ( ۴ ) راہ و رخنہ یافتن الفاظ و متاورات عوام در چہان نظم -
- ( ۵ ) سادہ گوئی -
- ( ۶ ) تسلسل مطلب -
- ( ۷ ) علل و اسباب ظاہر کردن و نتیجہ گرفتن -

(۸) ایجاد موضوع و مضمون بکر منہج و طبعی -

(۹) گرمیء حقیقی -

(۱۰) اوزان نو -

(۱۱) لازم ہی نہایند برائے برخے از مطالب مقالہ و این فہرست نمونہ از

نظم جدید نوشتہ شود لکن کتاب ' سخن‌وران عصر حاضر ' خود

نمونہ است -



## سائنس دان سوسائٹی علی گڑھ

از ایتھر

سر سید جامع حیثیات شخص ہوے ہیں - یہ وہ زمانہ تھا جب سوسائٹی کا شہراڑہ بکھر چلا تھا - زندگی کا ہر شعبہ دیکھا کی حالت میں تھا - دو تہذیبوں کے ٹکرانے سے اس تذبذب میں اور اضافہ ہو گیا تھا اس وقت ایک ایسے مخلص زمانہ شناس ، اور ثابت قدم شخص کی ضرورت تھی جو قوم کی ختمہ اور مردہ قوتوں کو جکائے ، ان اوہام اور استقام کو دور کرنے کی کوشش کرے جو گزشتہ تمدن اور حکومت نے پیدا کر دیے تھے - اور اقتضائے زمانہ کے لحاظ سے ان کی ضروریات کو پورا کرے اور جدید حالات کی رو سے ان کی روش کو بدلے - سر سید نے اگرچہ زندگی کے ہر اہم شعبے کی طرف توجہ کی لیکن ان کا سب سے بڑا کام تعلیمی اور علمی تھا - اور اسی کام کا ایک جز سائنس دان سوسائٹی کا قیام تھا - خود یہ نام اس تغیر کی خبر دے رہا ہے جو اس وقت عمل میں آ رہا تھا - یہ علمی سعی اردو زبان کے سلسلہ ارتقا کی ایک کڑی ہے اور اس لئے اس کا ذکر اردو زبان کے مطالعہ کرنے والوں کے لئے ضروری ہے -

سر سید نے سنہ ۱۸۶۳ء میں ایک تحریر اس عنوان سے کہ 'التماس بخدمت ساکنان ہندوستان در باب ترقی تعلیم اہل ہند' چھاپ کر شائع کی

جس کا خلاصہ مضمون یہ تھا کہ ہندوستان میں علم کے پھیلا نے اور ترقی دینے کے لیے ایک مجلس مقرر کرنی چاہیے جو اپنے قدیم مصنفوں کی عمدہ کتابیں اور انگریزی کی مفید کتابیں اردو میں ترجمہ کرا کے چھاپے \*۔ یہ تھی اصل بنیاد سائنٹفک سوسائٹی کی - چنانچہ دوسرے ہی سال انہوں نے اس خیال کو عمل میں لانے کی کوشش کی —

۹ جنوری سنہ ۱۸۶۳ ع کو سر سید نے غازی پور میں جہاں وہ صدر الصدور تھے ، اپنے مکان پر ایک جلسے کا انعقاد کیا جس میں یورپین اور دیسی اصحاب کا اچھا خاصا مجمع تھا۔ یہ جلسہ سوسائٹی کے قائم کرنے اور اس کے اغراض و مقاصد بیان کرنے کی غرض سے کیا گیا تھا - اس میں لفٹننٹ کرنل گریہم نے (جو سر سید کے بڑے دوست تھے اور اس وقت غازی پور میں سپرنٹنڈنٹ پولیس تھے) اور سر سید نے بہت مدلل اور معقول تقریریں کیں — سر سید کا یہ خیال بالکل صحیح تھا اور اب بھی تقریباً ۷۰ سال گزرنے اور مغربی تعلیم کی بکثرت اشاعت ہونے کے بعد بھی وہ خیال ویسا ہی صحیح ہے کہ علوم جدیدہ کی اشاعت اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک کہ علمی کتابیں دیسی زبان میں ترجمہ نہ کی جائیں - مولانا حالی لکھتے ہیں کہ ” انہوں نے اس بات کو انگریزی تعلیم کے پھیلا نے سے بھی زیادہ ضروری اور مقدم سمجھا “ - مولانا نے اس سوسائٹی کے مقاصد کو مختصر طور پر نہایت خوبی سے ان الفاظ میں ادا کیا ہے : —

” جو (یعنے سائنٹفک سوسائٹی) اس غرض سے قائم کی گئی تھی کہ تقریری اور علمی کتابیں انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرا کر مغربی لٹریچر اور مغربی علوم کا مذاق اہل وطن میں پیدا کیا جائے ، علمی مضامین پر

لکچو دیے جائیں، رعایا کے خیالات گورنمنٹ پر اور گورنمنٹ کے اصول حکمرانی رعایا پر ایک ایسے اخبار کے ذریعے سے ظاہر کیے جائیں جو اردو و انگریزی دونوں زبانوں میں شایع ہوا کرے، ہندو مسلمان اور انگریز تیلوں قوموں کے ممبر اس میں شامل کیے جائیں اور اس طرح قومی مغائرت اور مذہبی تعصبات اور جو جھجک ہندوستانہوں کے دلوں میں انگریزوں کی طرف سے ہے اس کو آہستہ آہستہ کم کہا جائے، ابتدا ہی میں ۱۲۹ ممبر ہو گئے۔ جس میں ہندو مسلمان انگریز سب شریک تھے۔

اسی سال (یعنی سنہ ۱۸۶۳ ع میں) سر سید غازی پور سے تبدیل ہو کر علی گڑھ آ گئے۔ ”چرنک غازی پور میں سائٹنگ سوسائٹی کا ان کی غیبت میں چلنا ناممکن تھا“ اس لئے سوسائٹی کا تمام سامان اور اسٹاک وہ اپنے ساتھ علی گڑھ لے آئے۔ مسٹر ولیم جنکس بریملی جو اس زمانے میں علی گڑھ کے چیف تھے، سوسائٹی کے پریسیدنٹ قرار پائے۔ اور اسی وقت سوسائٹی کے لئے ایک مستقل مکان بلڈے کی تجویز ہوئی اور سر سید کی نگرانی میں عمارت کی تعمیر شروع ہوئی۔ مکان کی تعمیر اور آرائش اور کتب و آلات وغیرہ پر تقریباً تیس ہزار روپے کی لاگت آئی اس کا سنگ بنیاد سنٹنٹ گورنر شمال مغرب (۱۷-۲۰ دسمبر) نے ۳ نومبر ۱۸۶۳ ع کو رکھا تھا اور ۳ مارچ سنہ ۱۸۶۱ ع کو جب عمارت بن کر تیار ہو گئی تو مسٹر ولیمس کمشنر قسمت میرتھ کے ہاتھ سے اس کا افتتاح ہوا۔ ڈیوک آف گائل وزیر ہند اس کے پیٹرن (سرپرست) اور اے۔ ڈریمنڈ سنٹنٹ گورنر شمال مغرب وائس پیٹرن قرار پائے۔ اولین سکریٹری لفٹنٹ کرنل گریہم، اس کے بعد سر سید ہوئے۔ اگرچہ سوسائٹی کا پہلا قانون سنہ ۱۸۶۴ ع میں بمقام غازی پور بنا لیکن جب سوسائٹی کا دفتر علی گڑھ میں منتقل ہو گیا تو سنہ ۱۸۶۷ ع میں اس میں

کسی قدر ترمیم کی گئی۔ سوسائٹی کے اغراض اور قواعد حسب ذیل قرار دیے گئے۔۔  
( لقب اور مقصد )

اس مجمع کا نام سین ٹھنک سوسائٹی پہلے علمی سوسائٹی کہا جائے گا اور مقصد اس کا یہ ہوگا:۔

(۱)۔ ان علوم و فنون کی کتابوں کا جن کو انگریزی زبان میں یا یورپ کی کسی اور زبان میں ہونے کے سبب ہندوستانی نہیں سمجھ سکتے ایسی زبانوں میں ترجمہ کرنا جو ہندوستانیوں کے عام استعمال میں ہوں۔

(۲)۔ جب کبھی سوسائٹی مناسب سمجھے تو کوئی ایسا اخبار یا کُوت یا روزنامچہ یا میگزین وغیرہ چھاپ کر مشتہر کرنا جس سے ہندوستانیوں کے فہم و فراست کی ترقی متصور ہو۔

(۳)۔ ایشیا کے قدیم مصنّفین کی کم یاب اور نفیس کتابوں کا تلاش کر کر بہم پہنچانا اور چھاپنا۔

(بذات سوسائٹی کی)

(۴)۔ سوسائٹی میں (اول) معاون ممبر (دوسرے) آنریری ممبر (تیسرے) رفقائے سوسائٹی ہر وہ ہیں گے اور سوسائٹی کے پیٹرن یعنی مربی اور وائس پیٹرن یعنی نائب مربی بھی مقرر ہوا کریں گے۔

معاون ممبر دو قسم کے ہوں گے (اول) ممبران حضوری یعنی وہ ممبر جو ایسے مقام میں یا اس کے قریب رہتے ہوں جہاں سوسائٹی کا اجلاس ہوتا ہو۔ (دوسرے) ممبران مکاتبت یعنی وہ ممبر جو اس مقام سے جہاں سوسائٹی کا اجلاس ہوتا ہو فاصلے پر رہنے کے سبب سوسائٹی کے جلسے میں شریک نہ ہو سکیں اور بذریعہ خط و کتابت سوسائٹی سے ارتباط رکھیں۔

نعداد غیر محدود۔ چاندہ دو روپیہ ماہانہ۔

آنریری ممبروں کی تعداد دس سے اور رفقاءے سوسائٹی کی تعداد پانچ سے زیادہ نہ ہوگی۔

صاحبانِ تدریحترز پبلک انسٹرکشن بنگال اور شمال مغرب اور سنٹرل انڈیا اور اودہ و پنجاب موجودہ وقت بشرطیکہ وہ قبول کریں آنریری ممبر \* ہوں گے۔

رفقاءے سوسائٹی ایسے شخص ہوں گے جو بسبب تحصیل علم یا علوم کے نہایت نامی ہوں مگر ممبری کے عہدہ پر مقرر ہونے کا ان کو کچھ خیال نہ ہو۔

کونسل مشیر کے ذمہ ترجمہ و ترتیب کتب، ترجموں کی پسندیدگی و ناپسندیدگی نیز یہ تجویز کہ ترجمہ اردو، فارسی، عربی، ہندی میں کیا جاوے یا کن کن زبانوں یا کس زبان میں کیا جاوے۔

کونسل کارپرداز۔ ذمہ دار منتظم اور ایک کتب خانہ کا قیام۔

جو عمارت سوسائٹی نے علی گڑھ میں بنائی وہ علی گڑھ انسٹیٹیوٹ کھلائے گا اور جہاں تک ممکن ہوگا ہر قسم کی عجیب عجیب چیزیں اس مکان میں عجائب خانہ کی غرض سے جمع کی جائیں گی اور ان چیزوں کے حالات وقتاً فوقتاً مشتہر کیے جایا کریں گے۔

۳۰ مارچ ۱۸۶۶ء سے انسٹیٹیوٹ گزٹ جاری ہوا۔ یہ اخبار پہلے

ہفتہ وار تھا پھر ہفتے میں دو بار نکلیے لگا۔ ادیٹر خود سرسید تھے۔ مولانا حالی نے اس اخبار کے متعلق جو رائے لکھی ہے وہ اس قدر معتول اور صحیح ہے کہ اس کے بعض حصوں کا یہاں نقل کر دینا کافی ہے۔

”اول اول سرسید زیادہ تر اس میں پولٹیکل معاملات پر مضامین

اور نوٹ لکھتے تھے؛ اس لیے اس کی ابتدائی جلدوں کو ان کے پولیٹیکل ورکس کا ایک مجموعہ کہا جاسکتا ہے۔ اس اخبار کی بڑی خصوصیت یہ تھی کہ اس کا ایک کالم انگریزی میں اور ایک اردو میں ہوتا تھا اور بعض مضامین اردو میں الگ اور انگریزی میں الگ چھاپے جاتے تھے؛ اس لیے اس سے انگریز اور ہندوستانی یکساں فائدہ اٹھا سکتے تھے۔ اس کا خاص مقصد گورنمنٹ اور انگریزوں کو ہندوستانیوں کے حالات اور معاملات اور خیالات سے آگاہ کرنا اور ہندوستانیوں کو انگریزی طرز حکومت سے آشنا کرنا اور ان میں پولیٹیکل خیالات اور قابلیت اور مذاق پیدا کرنا تھا۔ اس کی ابتدائی جلدوں کے دیکھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ انگریزی خیالات کو ہندوستانی لباس میں اور ہندوستانی خیالات کو انگریزی لباس میں ظاہر کر کے دونوں قوموں کو ملانا چاہتا ہے۔

اس میں سوشل، اخلاقی، نسلی اور پولیٹیکل ہر قسم کے مضامین برابر چھپتے تھے۔ جب تک سرسید کی توجہ دوسری جانب مائل نہیں ہوئی، علاوہ اُن لیڈنگ آرٹیکلوں کے، جو وہ خود لکھتے تھے، انگریزی اخباروں سے عمدہ عمدہ آرٹیکل جو معاملات ہندوستان سے علاقہ رکھتے تھے برابر ترجمہ ہو کر چھپتے رہتے تھے۔ ہندوستان کے طریق معاشرت یا تعلیم یا کس عامی یا تاریخی تحقیقات کے متعلق جتنے لکچر سوسائٹی میں دیے جاتے تھے وہ سب اس کے ذریعے سے شایع ہوتے تھے۔

اگرچہ یہ اخبار ملک کی سوشل اصلاح کا ہمیشہ ایک عمدہ آلہ رہا ہے اور اول اول کئی سال تک جس قدر زمانہ حال کی نئی اطلاعات اس کی بدولت ہندوستانیوں کو حاصل ہوتی رہی ہیں اُن کے لحاظ سے یہ کہنا کچھ مبالغہ نہیں ہے کہ کم سے کم شمالی ہندوستان میں عام خیالات

کی تبدیلی اور معلومات کی ترقی اس پرچے کے اجرا سے شروع ہوئی ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی پولیٹیکل معاملات میں جو وقعت اور اعتبار اس پرچے نے گورنمنٹ اور حکام کی نظر میں حاصل کیا وہ آج تک کسی اخبار نے حاصل نہیں کیا۔

... .. ایک خاص وصف، جو اس اخبار کے ساتھ مخصوص تھا اور جو اس کو ہندوستانوں کے عام انگریزی اور دیسی اخباروں سے ممتاز تھیوتا تھا وہ یہ تھا کہ اس نے اپنے طرز تحریر میں برخلاف اپنے تمام ہم عصروں کے کبھی کسی قوم یا فرقے یا کسی خاص شخص کی دلازاری روا نہیں رکھی۔ اس نے اپنے لاکھوں کے خوش کرنے کے لیے، جو ہمیشہ نوک جھوک اور چھہڑ چھارے سے خوش ہوتے ہیں، سنجیدگی اور متانت کو کبھی ہاتھ سے نہیں دیا۔ اس نے ہندوستان کی کسی قوم کی نسبت دوستی اور خیر خواہی کے خلاف کبھی ایک حرف نہیں لکھا۔ کبھی کسی ہندو یا مسلمان ریاست یا اس کے اہلکاروں پر زہر نہیں اگلا۔ ہندو مسلمانوں کے مذہبی جھگڑوں سے وہ ہمیشہ بے تعلق رہا اور اگر کبھی کچھ بولا تو دونوں کو صلح و آشتی کی نصیحت کی۔

یہ سب سچ ہے لیکن یہ اسی وقت تک تھا جب تک کہ کالج اور دوسرے کاموں کا ہجوم نہیں ہوا تھا۔ آخر میں تو یہ ”ماخوذ از پانیر“ ہو کے رہ گیا تھا۔ لیکن جب کوئی خاص مسئلہ یا اہم معاملہ آجاتا تھا تو سرسید خود بڑے پُر زور مضامین لکھتے تھے۔

ابتدا میں منشی محمد یار خاں آدیتری کا کام کرتے تھے اور منشی چکھن لال انگریزی اخبارات کا ترجمہ کرتے تھے۔ مولوی فیض الحسن اور

بابو گنگا پرشاد مترجم کتب تھے - اجرت پر بھی کام ہوتا تھا - کل عملہ پانسو روپیہ ماہانہ کا تھا —

ایک کتب خانہ بھی قائم کیا گیا اور آلات علمی اور کلوں کے نمونے فراہم کیے گئے اور لکچروں کا سلسلہ قائم ہوا - ڈاکٹر کلکلی ہر مہینے ایک لکچر ، نیچرل سائنس پر دیتے تھے اور علمی آلات سے جو سوسائٹی میں موجود تھے حاضرین کو تجربے دکھاتے تھے —

سوسائٹی کی ترقی اور فروغ کا سارا دار و مدار سرسید پر تھا - انہوں نے اپنی ذاتی کوشش اور محنت اور سالانہ چندوں اور عطیات سے سوسائٹی کو بہت کچھ فائدہ پہنچایا - اپنا ذاتی پریس جو ”تبئین الکلام“ کے چھاپنے کے لیے خریدا تھا ، سوسائٹی کے نذر کر دیا - جون سنہ ۱۸۶۶ ع میں جب نواب سکندر بیگم والیہ بھوپال نے یہ سنا کہ سید احمد خان نے ہندوستانیوں کی بہبودی کے لیے یہ سوسائٹی قائم کی ہے تو انہوں نے بطور اظہار خوشنودی ایک اساس کی انگوٹھی قیمتی ایک ہزار روپیہ سرسید کو بھیجی - سرسید نے ایک جلسہ عام میں یہ انگوٹھی سوسائٹی کو دے دی - اسی طرح محض سوسائٹی کو فائدہ پہنچانے کے لیے سرسید نے فوج داری اور کلکٹری کے مختاروں اور وکیلوں کو قانون پر لکچر دینے شروع کیے اور اس سے جو فیس وصول ہوتی تھی وہ سوسائٹی کے نذر کر دیتے تھے —

گورنمنٹ اور روسا امرا اور حکام نے بھی اس کی معقول امداد کی - گورنمنٹ نے تین ایکڑ تین روٹ اور تیس پونڈ زمین سرکاری تعمیر مکان کے لیے اور ایک باغ سرکاری علم فلاح کی ترقی اور امتحان کے لیے عطا کی - مہاراجہ جودھپور نے سو روپیہ سالانہ ، مہاراجہ کھورتھلہ نے پچاس روپے ، مہاراجہ جے پور نے پچاس اور نواب رام پور نے سو روپے سالانہ

امداد مقرر کی - وائسرائے اور لفٹننٹ گورنر ریفرہ نے چندوں سے مدد کی - سر جان لارنس کو خاص توجہ تھی - مسٹر ڈریملڈ لفٹننٹ گورنر شمال مغرب اور مکلوٹ لفٹننٹ گورنر پنجاب نے بھی چاندے دیے - نواب کلب علی خان نے بارہ سو روپے کی ایک نقرئی کرسی سوسائٹی کو دی مہاراجہ الورد اور مہاراجہ اندور اور نواب تونک نے بھی عطیات دیے - مہاراجہ بذارس کو بھی اس سے خاص دلچسپی تھی - عنایت اللہ خان رئیس بھیکم پور نے دو سو روپے تعمیر چاہ کے لیے دیے - سر آکلڈ کالون ، مسٹر سیپٹ کلکٹر میرتھہ اور مسٹر کیمن ڈائریکٹر تعلیمات بھی اس کے بڑے معاون تھے - سر سید کی کوشش کا یہ نتیجہ ہوا کہ سالانہ چندے اور اخبار کی قیمت کی تعداد دس ہزار آٹھ سو پچاس تک پہنچ گئی —

۱۰ - اگست سنہ ۱۸۶۷ع میں جب سر سید عہدہ چیف سال کاز کورٹ پر ترقی پا کر علی گڑہ سے بذارس چلے گئے تو سوسائٹی کا تمام کاروبار راجہ جے کشن داس سی - ایس - آئی کو جو اس زمانے میں علی گڑہ میں ڈپٹی کلکٹر تھے سپرد کیا گیا اور انہوں نے بڑی توجہ سے اس کام کو سرانجام دیا - لیکن سر سید بذارس میں رہ کر بھی برابر سوسائٹی کی اعانت کرتے رہے اور ان کے مضامین سوسائٹی کے اخبار میں شایع ہوتے رہے -

”سنہ ۱۸۶۷ میں سر سید بقتدریب تعطیل دسہرہ بذارس سے علی گڑہ میں آئے اور ضلع علی گڑہ کے اکثر زمینداروں پر اس بات کو ظاہر کیا کہ اب تک سوسائٹی کی کوئی مستقل آمدنی نہیں ہے؛ کوئی ایسی تدبیر کرنی چاہیے کہ اس کی آمدنی مستقل ہو جائے - بہت سے زمینداروں نے یہ تجویز کی کہ اس ضلع کے تمام دیہات سے کم از کم ایک روپیہ سالانہ ہمیشہ کے لیے سوسائٹی کے قیام کے واسطے مقرر کیا جائے؛ اور

اس کی شرائط واجب العرض میں ہر وقت بلڈریسٹ کے درج ہو جائیں تاکہ نسل بعد نسل ہمارے وارثوں میں سے کوئی کچھ عذر نہ کرنے پائے۔ چنانچہ ۱۲ اکتوبر سنہ ۹۷ ع کو سوسائٹی کے جلسے میں سر سید نے یہ تجویز پیش کی اور ایک فہرست زمیلداران درخواست دہندہ کی مع ان کی عرضیوں کے اور مع تفصیل ۱۳۳ دیہات کے چارج ہلری لارنس کلکٹر ضلع علی گڑھ کی خدمت میں اپنی چٹھی کے ذریعہ سے بھیج دی تاکہ وہ اس کی تصدیق کر کے گورنمنٹ میں رپورٹ کریں۔ اور صاحب کلکٹر نے وہ تمام کاغذات گورنمنٹ میں اپنی رپورٹ کے ذریعہ سے روانہ کر دیے۔ اس کا نتیجہ سوا اس کے اور کچھ معلوم نہیں ہوا کہ اس کے جواب میں جو چٹھی پرائیویٹ سکرٹری گورنمنٹ انڈیا مورخہ ۱۸ اکتوبر سنہ ۹۷ ع بلام سر سید وصول ہوئی اس میں حضور واٹسراے کی طرف سے دھامندی ظاہر کی گئی تھی“ \* —

۹۔ مئی سنہ ۱۸۶۸ ع کو سوسائٹی نے ایک ادریس سر ولیم میور لنٹنٹ گورنر شمال مغرب کی خدمت میں پیش کیا اور سوسائٹی کی درخواست پر سر ولیم میور نے وعدہ کیا کہ جو کتابیں دیسی زبان میں تصنیف و تالیف یا ترجمہ کی جائیں گی ان میں گورنمنٹ ضرور امداد دے گی۔ چنانچہ ۲۶۔ اگست سنہ ۱۸۶۸ ع کو گورنمنٹ شمال مغرب نے دیسی کتابوں پر انعام دینے کا اعلان کیا۔ ”اگرچہ انعام سے کچھ زیادہ آدمی مستفید نہیں ہرے اور اشتہار کی ميعاد چند سال بعد گزر گئی لیکن اس اشتہار کا اثر اس تمام گروہ میں جو دیسی زبانوں میں تصنیف و تالیف کی کم و بیش لہاقت رکھتا تھا۔ مگر اس لہاقت کو کام

میں لانا نہیں جانتا تھا، برقی قوت کی طرح دور گیا۔ انہوں نے اپنی تصنیفات سے ملک کو بھی فائدہ پہنچایا اور خود بھی حق تصنیف سے فائدہ اٹھانا سیکھ گئے۔ خصوصاً اردو لٹریچر صرف اس تحریک کی بدولت جو کہ اشتہار مذکور نے ملک میں عموماً پیدا کر دی تھی تھوڑے عرصہ میں توقع سے بہت زیادہ ترقی کر گیا،\* —

سر سید کی دور اندیشی سوسائٹی کے نام سے ظاہر ہے۔ اس زمانے میں جدید خیالات کی اشاعت اور سائنس کا ذوق پیدا کرنا بہت بڑا کام تھا۔ جب سوسائٹی علی گڑھ میں منتقل ہوئی تو اس نام کے متعلق اختلاف پیدا ہوا اور سر سید بھی کسی قدر مائل ہو گئے تھے کہ یہ نام بدل دیا جائے لیکن جب طریقہ و علم کاشتکاری اور علمی عجائبات کا رہنا طے ہو گیا تو یہی نام مناسب خیال کیا گیا اور آخر تک یہی نام قائم رہا۔ سائنس کے لکچروں کے سلسلے کے علاوہ جس کا ذکر پہلے آچکا ہے علمی تجزیے بھی کیے گئے اور علم فلاحیت کے اصول کے مطابق سوسائٹی کے باغ میں گدھوں بویا گیا اور جب تیار ہو گیا تو جاسے میں اس کا نمونہ دکھایا گیا۔ ایک ایک دانے میں ساٹھ ساٹھ ستر ستر شاخیں نکلیں اور بعض میں سو سے بھی زیادہ پھوت کر مثل پولے کے جھانڈ کے ہو گیا تھا۔ پودے کا طول ۳ فٹ ۸ انچ اور بال مع تور کے ۱ انچ لمبی تھی۔ نو قسم کے گدھوں لندن سے ملگائے گئے۔ خود سر سید نے ایک ایک دانہ بونے کے لیے ایک آہلی نلی ایجاد کی اور علم فلاحیت پر ایک رسالہ لکھنا شروع کیا۔ مختلف علوم و فنون کی کتابوں کی تالیف اور مغرب اور مشرق کی اعلیٰ درجے کی کتابوں کا ترجمہ اس سوسائٹی کا بہت بڑا مقصد تھا۔ علمی ذوق پیدا کرنے کا یہ

بڑا ذریعہ تھا۔ سر سید نے پولیٹیکل اکانمی، نیچرل فلاسفی، علم آب و ہوا کے  
 سوں کی سفارہ کی۔ کونل جے ڈیلو ہیملٹن نے پہلے ہیرو توتس کے تاریخ مصر کے  
 سے کی اور بعد ازاں تمام تاریخ کے ترجمے کا مشورہ دیا اور لکھا کہ مقاموں اور  
 صوں کے ناموں کے معاملے میں بہ نسبت یونانی کے عربی زبان کی پیروی  
 چاہیے اور جو تلفظ کسی لفظ کا یورپ یا ایشیا کی زبان میں مروج ہو  
 اختیار کیا جائے۔ انگریزی زبان کی تقلید لازم نہیں۔ ہندی کے  
 ف ت اور ڈ کا استعمال نہ کیا جائے۔ ہیئت اردو جہاں لوجی (ارضیات) کے  
 سے کی بھی راے دی۔ دوسرے خط میں سفارش کی کہ ایک عمدہ  
 لغت مصر مسمیٰ حسن المتکافرة مصنفہ سیوطی ہے۔ ہشت بہشت کا نسخہ  
 بھیجا جو ادریس بدخشی کی تصنیف ہے جس میں شاہ مراد کی  
 ۸۵۵ ہجری تک کے حالات ہیں۔ مصنف کے بیٹے ابوالفضل الاختری  
 سے ۹۸۲ ہجری تک پہنچایا، لیکن یہ نسخہ اصل مصنف کا تھا جو  
 تک ہے۔ انہوں نے ہرن صاحب کی تاریخ کے ترجمے کی بھی راے دی۔  
 خود سر سید نے دو کتابوں کی تالیف کا بیڑا اٹھایا۔ ایک تمام اردو  
 لغت کا نظم و نشر کی فہرست کی ترتیب بطور تاریخ زبان اردو۔ اس  
 امور ذیل کی صراحت کی جائے گی۔

نام کتاب۔ نام مصنف مع مختصر حال۔ زمانہ تصنیف۔ کچھ عبارت

نمونہ طرز بیان اور بعض مضامین کا خلاصہ۔

معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب کے لکھنے کی نوبت نہیں آئی۔

دوسرے اردو لغات جو سر سید نے لکھنی شروع کر دی تھی، اس کا  
 موجود ہے جو آئندہ ہم اس رسالے میں پیش کریں گے۔ اس پر بعض

بہن فاضلوں نے رائیں بھی لکھیں۔

یہ دونوں تجویزیں نہایت قابل قدر اردو زبان کے استحکام کے لئے لازم ہیں۔ سرسید کے صحیح ادبی ذوق اور دور بھلی کا اسی ایک بات سے پتا چلتا ہے کہ انہوں نے ۶۶ برس پہلے اس چیز کا ذوق ڈالا تھا جس کی تکمیل پر ہم آج غرر کر رہے ہیں۔

سوسائٹی نے تقریباً چالیس علمی اور تاریخی کتابیں انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرائیں جن میں سے بعض کے نام جو ہمیں معلوم ہوئے ہیں ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔

- ۱- تاریخ مصر قدیم موافق رولن -
- ۲- تاریخ یونان مولفہ رولن -
- ۳- رسالہ علم فلاحت اسکات برلن -
- ۴- تاریخ چین بزبان فارسی قلمی ترجمہ پادری ایکسوس -
- ۵- تزک جہانگیری قلمی -
- ۶- رسالہ عام انتظام مدن (پولیٹیکل اکانمی) مولفہ ولیم سیلور -
- ۷- ایک گفتگو بر عہد لارڈ ڈلہوزی و لارڈ کیننگ مترجمہ لغت لٹ کونل گریہم بزبان اردو -
- ۸- تاریخ ہند مولفہ الفلستین -
- ۹- رسالہ علم آلات مولفہ تامسن -
- ۱۰- رسالہ علم طبیعیات مولفہ تامسن -
- ۱۱- رسالہ عام آب و ہوا مولفہ تامسن -
- ۱۲- رسالہ برق مولفہ ہیبرس -
- ۱۳- دیباچہ تاریخ فیروز شاہی -
- ۱۴- تاتہ ہلتر کی کتاب اقلیدس مترجمہ مولوی ذکاء اللہ -

- ۱۵ - جغرافیہ مولفہ پادری ولکنسن —
- ۱۶ - سیاست مدنی (پبلک پولیٹیکل اکانومی کا انتخاب) مترجمہ پڈتات دھرم  
نراین رائے بہادر میرمنشی اندور —
- ۱۷ - ترجمہ علم مساحت مولفہ ٹاڈ ہنٹر —
- ۱۸ - ترجمہ علم مثلث مولفہ ٹاڈ ہنٹر —
- ۱۹ - ترجمہ الجبرا مبتدیوں کے لیے مولفہ ٹاڈ ہنٹر —
- ۲۰ - ترجمہ نظریہ مساوات مولفہ ٹاڈ ہنٹر —
- ۲۱ - گال بریتھ اور ہاتھن کے سائنٹفک میٹول یوکلیڈ کا ترجمہ —
- ۲۲ - گال بریتھ اور ہاتھن کے سائنٹفک الجبرا کا ترجمہ —
- ۲۳ - برنارڈ سمیتھ کی ارتھمیٹک کا ترجمہ —
- ۲۴ - برنارڈ سمیتھ کے الجبرا کا ترجمہ —
- ۲۵ - گال بریتھ کی کتاب حساب کا ترجمہ —
- ۲۶ - ٹاڈ ہنٹر کے الجبرا کا ترجمہ (کالجوں اور مدارس کے لیے) —
- ۲۷ - گال بریتھ کی Plain علم مثلث —
- ۲۸ - ٹاڈ ہنٹر کی Plain co-ordinate geometry —
- ۲۹ - ٹاڈ ہنٹر کا (Integral Calculus) تکمیلی احصا —
- ۳۰ - ٹاڈ ہنٹر کا (Differential Calculus) تفرقی احصا —
- ۳۱ - ترجمہ تاریخ ایران مولفہ سرجان مہلکم —

دہلی کالج اور اس کی ورنیکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی کے بعد یہ دوسرا  
ادارہ تھا جس نے انگریزی سے مختلف علوم و فنون کے ترجمہ اردو زبان  
میں شایع کیے۔ یہ کام جب آج کل دشوار نظر آتا ہے تو اس وقت کس  
قدر دشوار ہوگا جب نہ اچھے مترجم دستیاب ہوتے تھے اور نہ ان ترجموں

کی قدر کرنے والے کچھ زیادہ تعداد میں تھے۔ علاوہ اس کے عجائب خانے کے لئے سکے بھی جمع کیے۔ چنانچہ مسٹر تھارن ہل، جج سہارن پور اور مولوی فضل احمد تحصیلدار قائم گلیج نے کچھ سکے بھیجے۔ ایک اشرفی

عہد تعلق کی عنایت اللہ خاں صاحب رئیس بھیم پور نے دی —

سر سید کا قاعدہ تھا کہ وہ جس کام کا بیڑا اٹھاتے تھے ہاتھ دھو کے اس کے پیچھے پڑ جاتے تھے، چنانچہ سوسائٹی کی بہبودی اور ترقی میں انہوں نے کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ ”ضلع کے رئیسوں کو اس کی امداد پر آمادہ کیا گورنمنٹ کو اس کی طرف توجہ دلائی، خود اپنی بساط سے بڑھ کر اس کو مالی امداد پہنچائی، اس کی عالیشان عمارت اپنے اہتمام اور نگرانی میں بنوائی، اس کی مستقل آمدنی کے لیے عمدہ عمدہ تدبیریں کیں، لائق لائق آدمی ترجمے کے کام کے لیے مقرر کیے، قریب چالیس کے چھوٹی بڑی علمی اور تاریخی کتابیں انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرائیں، غازیپور ’علی گڑھ‘ بڈارم جہاں کہیں رہے سوسائٹی کے اخبار کو اپنے عمدہ مضامین سے برابر مدد پہنچاتے رہے یہاں تک کہ ہندوستان چھوڑنے کے بعد بھی سوسائٹی کی دھن میں برابر لگے رہے۔ چنانچہ ولایت جاتے ہوئے جو خط کہ انہوں نے مولوی سید مہدی علی خاں کو عدن سے بھیجا تھا اس میں لکھتے ہیں کہ ”مجھ کو علاوہ مفارقت احباب کے یہ رنج بڑا ہے کہ میرے پیچھے لوگ عقل کے دشمن سائٹنگ سوسائٹی کی بڑی مخالفت کریں گے اور کوئی درجہ سعی کوشش کا واسطے شکست کر دینے سوسائٹی کے باقی نہ رکھیں گے۔ پس میں چاہتا ہوں کہ آپ سوسائٹی کی طرف زیادہ متوجہ ہوں اور اس کے سپنہالنے اور مسبروں کے بڑھانے میں زیادہ کوشش فرمائیں“ \* —

مختص سوسائٹی کی خاطر کلکتہ کا سفر اختیار کیا اور ۶ اکتوبر سنہ ۱۸۸۳ ع کو مذاکرہ ہلمیہ میں ایک پریل لکچر فارسی زبان میں سوسائٹی کے اغراض و مقاصد پر دیا —

اس سوسائٹی کے ذریعہ سے بعض تعلیمی تحریکیں بھی کی گئیں - مثلاً تحصیلہ مکاتب کے نصاب تعلیم پر غور کرنے کے لیے ایک کمیٹی مقرر کی گئی - اسی سوسائٹی کے ضمنی نتائج میں سے ورثیکلر یونیورسٹی کی تحریک تھی جو اس زمانے کے لیے ایک عجیب خیال تھا - اس کا حال ہم آئندہ ایک علیحدہ مضمون میں لکھیں گے —

اس سوسائٹی نے نہ صرف علمی اور تعلیمی خدمات انجام دیں بلکہ اس کی دیکھا دیکھی ملک کے مختلف مقامات میں متعدد انجمنیں اور سبھائیں قائم ہو گئیں جو اپنے اپنے حلقے میں مفید کام کرتی تھیں - سوسائٹی کے اخبار کا اردو اور دوسرے دیسی اخبارات پر بھی بہت اچھا اثر پڑا اور وہ سیاسی، معاشرتی اور تعلیمی مسائل پر سلجھدگی سے بحث کرنے لگے - اس سوسائٹی اور تہذیب الاخلاق کا اردو زبان اور ادب پر بڑا احسان ہے —

(اس مضمون کے لکھنے میں علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ کی مختلف جلدوں، گریہم کی لائف آف سید احمد خاں اور حیات جاوید سے مدد لی گئی ہے) —

# شمالی ہند میں اُردو شاعری کی ابتدا و ترقی

از

شیخ چاند صاحب ایم۔ اے۔ ایل ایل۔ بی

شمالی ہند میں اُردو شاعری کا باضابطہ آغاز دراصل بارہویں صدی ہجری کے اوائل میں ہوا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ عالمگیر کے عہد کے پس و پیش ایسے شعرا گزرے ہیں جن کے اشعار تذکروں میں مل جاتے ہیں۔ چنانچہ موسوی خان فطرت، خواجه عطا، جعفر، بیدل وغیرہ ایسے شاعر ہیں جن سے چند شعر منسوب ہیں۔ اسی زمانے (۱۱۰۵ھ) میں اسمعیل امرہوی نے ایک مثنوی ”تولد نامہ بی بی فاطمہ“ \* لکھی ہے۔ اس کے سوا بعض شاعروں کا کلام بھی دستیاب ہوتا ہے لیکن یہ دراصل ایسی کوششیں نہیں جن کا مستقل اور پائدار اثر قائم نہ ہو سکا اور ان شعرا نے شمالی ہند میں اُردو شاعری کے رائج کرنے میں کوئی قابل لحاظ مدد نہیں دی۔ شمالی ہند اور خصوصاً دہلی میں اُردو شاعری کے آغاز کی تاریخ عالمگیر کا چوالیسواں سنہ جلوس (۱۱۱۲ھ) ہے۔ یہ وہ تاریخ ہے جس میں بقول قائم ولی نے دہلی کا سفر کیا اور پہلی مرتبہ وہاں کے شاعروں کے حلقے میں اپنی ریختہ گوئی سے ہل چل ڈال دی۔

\* کتب خانہ مولوی عبدالحق صاحب —

اور جب ۱۱۳۳ھ میں بقول \* حاتم ولی کا دیوان دہلی پہنچا تو موزوں طبع شاعروں کو متاثر و متحرک کر دیا۔ یوں تو دکنی شاعروں کے کلام سے شمالی ہند کے شاعر اس سے قبل سے واقف تھے اور شمالی ہند کے بعض شاعروں کے کلام سے اس کی شہادت بھی ملتی ہے۔ قائم † (قائم چاند پوری سے قبل گزرا ہے) نے اپنے مرثیہ میں قادر کا ذکر اس طرح کیا ہے۔

قائم کا آج ہند میں شہرا ہوا بلند دکن میں اس کے شعر کہو قادر استیں مخزن نکات (مولفہ ۱۱۶۸ھ میں لکھا ہے کہ پینچاس سال قبل مرزائے دکنی کے مرثیے ہاتوں ہاتھ دکن سے شمالی ہند میں پہنچتے تھے اور عام طور سے پڑھے جاتے تھے لیکن ان کا کوئی بین اثر نہ پڑسکا۔ یہ صرف ولی کے کلام کی کرامت تھی کہ اس نے شمالی ہند کے شاعروں کو ریختہ کی طرف متوجہ و مائل کر دیا۔

اس کے مقلدین میں آبرو، حاتم، مضمون، مظہر جان جاں، احسن اللہ، شاکر ناجی، مصطفیٰ خاں یکرنگ ایسے شعرا ہیں جو اساتذہ میں شمار ہوتے ہیں۔ ولی کے تتبع میں طبع آزمائی کرنے کا ذکر ان میں سے بعض نے کیا ہے چنانچہ حاتم لکھتا ہے: ”در ریختہ ولی را استاد می داند“۔

آبرو کا ایک شعر ہے:۔

آبرو شعر ہے ترا اعجاز گو ولی کا سخن کرامت ہے

یہ شاعرانہ تعالیٰ ہے ولی کا ذکر کرنا ہی اس کے اثر کو تسلیم کرنا ہے۔ ولی کی تقلید سے اس کے مقلدین کے کلام میں ایک حد تک ہندی کا عنصر غالب تھا۔ اس ہندی عنصر نے اس قدر شدت اختیار کر لی تھی کہ ایہام کا رواج ہو گیا۔ ایہام کی بنیاد اس عنصر پر قائم ہوئی۔

بقول آزاد ” سلسکرت میں ایک لفظ کے کئی معنی ہیں اس واسطے اس میں برج بہاشا اور اُس کی شاخ میں ذو معین الفاظ اور ایہام پر دھروں کی بنیاد ہوتی تھی - فارسی میں یہ صنعت ہے مگر کم - اُردو میں پہلے پہل شعر کی بلا اسی پر رکھی گئی - ظاہر ہے کہ ایہام کا التزام ایک مصنوعی اور غیر فطری فعل تھا جس نے عام شاعری اور خصوصاً غزل کو اثر اور سادگی کے چوہر سے متحرک کر دیا - اس میں مضامین کے ادا کرنے سے بڑے کر ذو معنی الفاظ کے استعمال پر شاعر کی پوری قوت اور زور صرف ہو جاتا تھا، اس کا نتیجہ ظاہر ہے کہ کلام بے کیف اور بے لطف ہو جاتا تھا اور عام قبولیت حاصل کرنے سے محروم - اس دور کے اساتذہ کا کلام اٹھا کر دیکھیے تو شاعرانہ صناعتی اور ہنر مددی پر حرف رکھنے کو جگہ نہیں لیکن سادگی اور اثر کا فورہ ہیں، الفاظ کا ذخیرہ بافراط موجود ہے، اُن کے استعمال اور معانی کے مختلف پہلو روشن ہیں، عالم لسانیات اور محقق لغات کے لیے اُن کا کلام بیش بہا ذخیرہ ہے، لیکن کیف و لذت سے خالی ہے - ابتداً تو یہ طرز مقبول ہوئی لیکن بہت جلد یہ غیر فطری التزام و تصنع مردود ٹھہرا - ایہام گوئی کے مشہور علم بردار حاتم کو بھی یہ روش چھوڑنی پڑی چنانچہ جب سہ ۱۱۶۹ ہ میں اپنے کلام کا انتخاب ” دیوان زادہ “ کے نام سے کیا تو پرانی طرز کے کلام کو خارج کر دیا اور لکھا ہے :-

کہتا ہے صاف و شستہ سخن بسکہ بے تلاش حاتم کو اس سبب نہیں ایہام پر نگاہ  
ایہام گوئی کے خلاف تحریک کا آغاز در اصل اُن شعرا نے کیا جو ان ایہام کو اساتذہ کے بعد فوراً مجلس شاعری میں جلوہ افروز ہوئے -  
ان میں مظہر، سودا، میہر، اور درد وغیرہ خصوصیت کے ساتھ قابل

ذکر ہیں ان کے دور میں قدیم روش شاعری یک قلم متروک ہو گئی - اس عہد کی ابتدا میں بھی ایک طبقہ ایسا موجود تھا جو ایہام گوئی کا قائل تھا اور شاعری میں اس التزام کو ملحوظ رکھنے پر متنا ہوا تھا - میر کا شعر ہے :-

کہا جانوں دل کو کھینچے ہیں کہوں شعر میر کے  
کچھ طرز ایسی بھی نہیں ایہام بھی نہیں

اس سے صاف ظاہر ہے کہ ان کے ابتدائی دور میں ایہام کے ماننے والے موجود تھے اور اس صنعت کو شعر کی دلچسپی اور لطف کا موجب سمجھتے تھے - اس دور کے بھی بعض شعرا نے اس طرز میں طبع آزمائی کی ہے - سودا کی ایک غزل اسی رنگ میں ہے لیکن اُس نے صاف کہہ دیا ہے کہ یہ ابتدائی دور کے ایہام گو علم بردار مضمون اور 'آبرو' کی طرز ہے مجھے اس سے کوئی مناسبت نہیں :

اسلوب شعر کہنے کا تہرے نہیں ہے یہ مضمون و آبرو کا ہے سودا یہ سلسلا  
'آبرو' کی طرز میں ایک غزل لکھی ہے :

ہو شاد اس غزل سے روح آبرو کی سودا  
تو اس زمیں میں ناداں طور اپنا کیوں نہ بولے

میر حسن کا زمانہ کسی قدر بعد کا ہے ، لیکن اس نے بھی ایہام میں طبع آزمائی کی ہے ، چنانچہ اپنے تذکرے میں اپنے چند شعر بطور نمونہ نقل کیے ہیں ، جن کی نسبت لکھا ہے " چند اشعار بطور قدمائے ایہام بلداں گفتہ شد " - اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایہام گوئی کا اثر کچھ نہ کچھ باقی تھا اور شاعر کم از کم بطور تفریح ایہام میں طبع آزمائی کرتے تھے لیکن اسی زمانے میں لوگ اس سے بھزار ہوتے جاتے تھے جیسا

کہ سودا کے ادیب کے دو شعروں سے واضح ہے - یہی وجہ ہے کہ نوجوان شعرا کے حلقے میں یہ طرز مردود تھی - اس کے غیر نظری ہونے پر نظر کر کے اس کے خلاف شاعروں نے علم احتجاج بلند کیا - سودا نے صاف لکھا ہے :

یک رنگ ہوں آتی نہیں خوش متجو دو رنگی

ملکر سخن و شعر میں ایہام کا ہوں مہم

ایہام گوئی کی بے وقعتی میر صاحب کی رائے سے بھی ظاہر ہوتی ہے جو انہوں نے احسن اللہ کے اشعار کے حق میں ان الفاظ میں صادر کی ہے ”طبعش مائل بہ ایہام بود ازیں جہت شعر او بے رتبہ ماند“ -

مظہر ، سودا ، میر وغیرہ نے جب اس طرز کو چھیڑنا پسند نہیں کیا اور ایک نئی روش زیادہ وسعت اور پھیلاؤ کے ساتھ اختیار کی تو ان کو زیادہ دشواری اور دقت پیش نہیں آئی اس لیے کہ قدیم طرز سے عام بیزاری پھیل گئی تھی ، زبان بڑی حد تک بن چکی تھی ، الفاظ کا کافی ذخیرہ موجود تھا ، زبان کے ابتدائی قواعد اساتذہ کے کلام سے مستنبط تھے ، فارسی عروض مدتوں پہلے اردو شاعری کا بنیادی عنصر بن چکا تھا ، نئے دور کے مذاق نے کئی الفاظ و معاوردات کو متروکات میں داخل کر دیا تھا ، یہاں تک کہ کہلہ گو و مشاق بوزھا استاد حاتم بھی اس اثر سے نہ بچ سکا - ایسے بھی سنہ ۱۱۶۹ھ میں ”دیوان زادہ“ نئی طرز میں مرتب کرنا پڑا - ولی کی استادی کا اثر جس کا خود اس نے اعتراف کیا ہے ، زبان و خیال کے اعتبار سے کم ہونے لگا اور رفتہ رفتہ قدیم زبان بڑی حد تک متروک اور ہند کی زبان میں طبع آزمائی شروع ہو گئی - حاتم نے لکھا ہے :

ہند کی گفتگو انوکھی ہے چرب ہے سب ادیب یہاں کی زبان

میر حسن نے بھی قدیم زبان کے ترک کرنے اور معانی و مضامین کی پیروی کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے ”چوں بنیاد ریختہ از زبان دکن است بذابریں صاحب سخنانِ اپن فن و معنی شناسانِ مغز سخن طرز زبانِ ہر دیار را معیوب نمی دانند و پیروی معانی می کنند“ - قدیم زبان میں اصلاح کا حال دیوان زادہ حاتم کے دیباچے سے واضح ہوتا ہے کہ کس طرح غیر مانوس ہندی عناصر کو خارج کر کے مروجہ زبان کے مطابق فارسی اجزا شامل کہے گئے :-

” لفظ ’در‘ و ’بر‘ و ’از‘ و ’واؤ‘ کہ نعل و حرث باشد در دیوان خود تقید دارد - دریں ولا از ده دوازده سال اکثر الفاظ را از نظر انداختہ لسان عربی و زبان فارسی کہ قریب الفہم و کثیر الاستعمال باشد و روز مرہ دہلی کہ مرزایان ہند و فصیحان رند در محاورہ دارند، منظور داشته، سوائے آن زبان ہر دیار بہ ہندی کہ آن را بہا کا گریڈ موقوف کردہ، محض روز مرہ کہ عام فہم و خاص پسند بود اختیار نمود..... این قاعدہ (قاعدہ متروکات) را تا کجا شرح دہد - غرض کہ خلاف محاورہ و غیر مصطلح و غلطی روز مرہ و نقصان فصاحت را دخل نہ باشد“ -

حاتم کے اس بیان سے قدیم زبان میں اصلاح کا اندازہ ہوتا ہے اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ ہندی عنصر کم ہوتا گیا اور فارسی عربی کے اجزا مستحکم ہوتے گئے - اس باب میں مظہر جان جاں نے اس قدر فلو کیا کہ اس زمانے میں ان کی اردو کو اہل فن نہ ریختہ کہتے تھے اور نہ فارسی بلکہ ان کی اردو کا حال بقول سودا ”کتا دھوبی کا

کہ گہر کا نہ گہات کا " تھا ۔ —

یہیں سے فارسی اور ہندی کے عناصر میں اعتدال و توازن پیدا کرنے کی کوشش کا آغاز ہوا۔ اس سلسلے میں میہر کے اس بیان پر نظر رکھنی چاہیے جس میں انہوں نے ریختہ کی اقسام کا ذکر کیا ہے اور آخر میں اس طرز کا ذکر کیا ہے جو اس دور میں رائج ہوئی۔ اس بیان سے یہ بھی واضح ہو جائے گا کہ ریختہ گوئی نے رفتہ رفتہ کہا صورت اختیار کی اور اس دور میں آکر اس کا کیا رنگ ہوا۔ یہ بیان چونکہ اس دور کے ایک مشہور استاد کا ہے اس لیے ہر طرح لائق غور ہے، میہر صاحب نے لکھا ہے : —

" ریختہ کی چاند قسمیں ہیں ..... پہلی یہ کہ ایک مصرعہ فارسی اور

ایک ہندی ہو مثلاً قطعاً امیر خسرو : —

زر گر پسرے چو ماہ پارا کچھ گھڑیے سنواریے پکارا

نقد دل من گرفت و بشکست پھر کچھ نہ گھڑا نہ کچھ سنواریا

دوسری قسم یہ ہے کہ آدھا مصرعہ ہندی ہو اور آدھا فارسی

جیسا کہ میہر معز کا شعر ہے —

از زلف سیاہ تو بدل دھوم پڑی ہے درخانۂ آئینہ گھتا جھوم پڑی ہے

تیسری قسم یہ ہے کہ فارسی کے حروف و افعال استعمال کیے

جائیں۔ یہ قبیح ہے۔ چوتھی قسم یہ ہے کہ ایسی فارسی ترکیبیں

لائی جائیں جو زبان ریختہ کے مذاہب ہوں۔ یہ جائز ہے۔

لیکن اسے غیر شاعر نہیں جانتا، ایسی ترکیبیں کہ جو ریختہ

یہ غالباً مظہر کے ابتدائی کلام کے متعلق رائے ہے ورنہ ان کا بعد کا کلام بہت پاک صاف

اور شستہ و رقتہ ہے —

کے لیے نامانوس ہوں معیوب ہیں اور اس کا جاننا بھی سلیقہ شاعری پر موقوف ہے۔ میں نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے۔ اگر فارسی ترکیب گذرگوے ریختہ کے موافق ہو تو مضائقہ نہیں۔ پانچویں قسم ایہام کی ہے کہ اس فن میں جس کا رواج شاعران سلف میں تھا۔ اب طبائع اس صنعت میں کم مصروف ہیں لیکن شستگی سے استعمال ہوتی ہے، ایہام کے معنی یہ ہیں کہ وہ لفظ ذو معنی ہو جس پر شعر کی بنیاد ہوتی ہے۔ ایک معنی قریب ہوں اور دوسرے بعید۔ معنی بعید سے شاعر کی مراد ہو اور قریب سے نہیں۔ چھٹی قسم وہ انداز شاعری ہے جسے ہم نے اختیار کیا ہے، یہ انداز تمام صنعتوں مثلاً تجلیس، ترصیع، تشبیہ، صفاے گفتگو، فصاحت بلاغت، ادا بندی، خیال، وغیرہ پر مکتوی ہے۔“

ریختہ کی یہ تعریف و تحدید ممکن ہے کہ تحقیقی نقطہ نظر سے بالکل صحیح ثابت نہ ہو لیکن اس قدر تو یقینی ہے کہ اس دور کے اساتذہ نے اردو شاعری کا انداز ہی بدل دیا اور اس میں وہ تمام ضروریات اور لوازمات اختیار کر لیے جو شاعری کو سوار نے اور بنانے میں کام آتے ہیں۔ ان تمام التزامات سے ظاہر ہونا ہے کہ فارسی کا اثر بہ شدت داخل ہو رہا تھا، لیکن زبان کو غیر مانوس ترکیبوں اور لغات سے پاک کر کے ہندی اور فارسی عناصر میں توازن و اعتدال بھی پیدا کیا جا رہا تھا۔

شمالی ہند میں جب اردو شاعری کا آغاز ہوا تو کنتی کے صرف چند شاعر تھے، ایہام کو بھی چند ہی تھے جس سے ظاہر ہے کہ اردو شاعری ابھی

زیادہ مقبول نہیں ہوئی تھی، لیکن ایہام گوئی کے خلاف کوشش شروع ہوئی تو شاعروں کی تعداد میں ایک غیر معمولی اضافہ ہو گیا۔ اس کا ثبوت ان تذکروں سے آسانی سے مل جاتا ہے جو اس دور میں لکھے گئے ہیں۔ سنہ ۱۱۱۵ھ میں مہر نے اپنے تذکرہ نکات الشعرا میں ایک سو چار شاعروں کا ذکر کیا ہے اور سنہ ۱۱۶۶ھ میں گردیزی نے اٹھانوے کا جن میں پچھیس شاعر ایسے ہیں جو مہر کے تذکرے میں شامل نہیں ہیں۔ سنہ ۱۱۸۸ھ میں قدرت اللہ شوق نے دو سو اٹھاسی شاعروں کا ذکر کیا ہے اور میر حسن نے قبل ۱۱۸۸ھ مابعد ۱۱۹۳ھ دو سو اٹھاسی کا۔ شورش نے سنہ ۱۱۹۳ھ میں تین سو چودہ شاعروں کا تذکرہ لکھا ہے اس کے بعد شاعروں کی تعداد میں اس شدت سے اضافہ ہونے لگا کہ حصر و شمار آسان نہیں۔ اس تعداد اور تدریجی ترقی پر جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ اردو شاعری نے تیس چالیس سال کے عرصے میں غیر معمولی مقبولیت اور ترقی حاصل کر لی۔ چنانچہ اس کا ثبوت ان مجلسوں کی کثرت سے بھی ملتا ہے جن میں ریختہ گو شاعر اپنا کلام سناتے تھے۔ فارسی گوئیوں کے لیے غزلوں کو منظر عام پر لانے کا ذریعہ مشاعرے تھے اس زمانے میں کئی جگہ مشاعرے ہوتے تھے۔ سب سے زیادہ مشہور سالانہ مشاعرہ مرزا بیدل کے عرس کے موقع پر ہوتا تھا۔ اس زمانے کے شاعروں کے کلام اوز دیگر تحریروں سے اس کا حال معلوم ہوتا ہے \* فارسی گوئیوں کے مشاعروں کے تور پر ریختہ گوئیوں نے مراختہ (صحبت ریختہ گوئیوں) کی بنا ڈالی تھی، چنانچہ مراختے کئی جگہ ہوتے تھے۔ مراختہ خان آرزو، یہ ہر قمری مہینے کی پندرہویں تاریخ کو خان آرزو کے مکان پر منعقد ہوا کرتا تھا۔ حاکم لاہوری نے اپنے

تذکرہ ” مردم دیدہ “ میں اس کا ذکر کیا ہے ، مراختہ خواجہ میر درد ، یہ بھی ہرمہیجے کی پادروہیں کردرد کے مکان پر منعقد ہوتا تھا ۔ معلوم ہوتا ہے کہ خان آرزو کے مراختے کا سلسلہ بلد ہوا تو انہوں نے اپنے ہاں یہ صحبت گرم کی ۔ کچھ دنوں یہ سلسلہ جاری رہا ۔ اس کے بعد درد نے یہ محفل اپنے ہاں رچانی بلد کردی اور میر تقی میر سے کہا کہ ان کے ہاں مراختے منعقد ہوا کریں ، چنانچہ میر کے ہاں یہ صحبت گرم ہونے لگی ۔ ان کے سوا میر نے اپنے تذکرے میں چند اور مراختوں کا ذکر کیا ہے ۔ مراختہ میر سجاد ، مراختہ جعفر علی خان زکی ، مراختہ میر علی نقی وغیرہ ۔ مشاعروں کی ترقی پذیر کثرت اور مجالس ریختہ کی ہنگامہ آرائی پر نظر کر کے ماننا پوتا ہے کہ فارسی کا چراغ تہمتا رہا تھا اور ریختہ گوئی کا ہر طرف بازار گرم تھا ۔

## گجرات کا باکمال شاعر ارد شیر خبردار

از

(جناب اختر حسین صاحب راے پوری)

دور حاضر کے گجراتی شاعروں میں ارد شیر خبردار کا مرتبہ — پ سے افضل اور بلند ہے - اس میں شک نہیں کہ اس امتیاز اور مقبولیت کی ایک بڑی وجہ اس کی قومی شاعری ہے اور وہ ستیاگرہ تحریک کا نہایت ہی نازک نگاہ ترجمان ہے - لیکن ہمارے خیال میں کوئی اصلاحی تحریک کسی آرٹسٹ کے جذبات میں وہ گرمی نہیں پیدا کر سکتی جو اس کی تخیل و قوت تخیلی کو تحریک دے سکے - اصلاح کا مقتضاء توازن ہے اور آرت کا ملکہ خود فراموشی اور بے بسی - لہذا شاعری جب اس میدان میں قدم رکھتی ہے تو صرف بغاوت اور انقلاب کی ہمدوا ہو سکتی ہے - اصلاح اور توازن کے ساز پر اس کا نغمہ بے کیف اور بے نمک رہ جاتا ہے - ارد شیر خبردار کی قومی شاعری میں وہ ولولہ اور جوش ہم نہیں پاتے جو اقبال اور نذراالاسلام کے ہاں بدرجہ اتم موجود ہے - لیکن اسے چھوڑ کر خبردار کے پاس جو سرمایہ رہ جاتا ہے وہ ایسا ہے کہ صرف گجرات ہی نہیں بلکہ تمام ہندوستان اس پر بجا طور پر فخر کر سکتا ہے اور آج اس کا تعارف ہم کسی قومی شاعر کی حیثیت سے نہیں بلکہ

ایک جمالیاتی آرتسٹ کی حیثیت سے کرارہ ہیں —

ہندوستان میں عشقہ شاعری نے دو مختلف راستے پکڑے - ایک تگور تو سنسکرت شاعروں کے لیے عام طور پر اور کالی داس کے لیے خاص طور پر مخصوص ہے - کالی داس فطری حسن کا دلدادہ تھا اپنے جذبات کو حسن و جمال کا آئینہ نہیں، بلکہ حسن فطوت اور مناظر قدرت کو اپنے متعسوسات کا درپن بناتا تھا - ندی نالے اور جنگل پہاڑ اپنی اپنی بولیوں میں سرگوشیاں کر رہے ہیں اور کالی داس بلا تکلف انہیں قلم بند کرتا چلتا ہے - یہ وہ زمانہ تھا جب روح اور مادے کی کش مکش میں دو گونیت پیدا نہ ہوئی تھی - بعد میں ویشنو اور بھکتی تحریکوں سے ویدانت، زوجانیت نوازی اور داخلیت کا اثر ہوتا اور شاعر نے مظاہرات کا آئینہ دار اپنی خردی کو بنایا - بذات خود قدرتی نظاروں میں کوئی کشش نہ رہی بلکہ شاعر کی ذہنی کیفیت پر ان کے نظاروں کا رد عمل کہیں زیادہ اہم قرار پایا - سنسکرت اور ہندی شاعری میں اس اختلاف نے بعدالمشرقین پیدا کر دیا - ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ آج کل کلاسیک سنسکرت شاعری کا سب سے باکمال نمائندہ ارد شیر خبردار ہے اور اس کی شاعری میں واردات عشق کے ظاہری و باطنی پہلوؤں کے امتزاج نے بڑی خوبی پیدا کر دی ہے —

ارد شیر خبردار کی زندگی ویسی ہی ہموار و یک رنگ رہی ہے جس کی توقع ہندوستان کے کسی متوسط طبقے کے فرد سے کی جاسکتی ہے - صوبہ بدیشی کے شہر دمن میں نومبر سنہ ۱۸۸۱ ع میں وہ ایک نامور پارسی گھرانے میں پیدا ہوا - بیشتر آرتسٹوں کی طرح اسکول کی تعلیم اسے غیر دلچسپ معلوم ہوئی اور اوایل عمر میں ہی وہ مدرسے سے

صلحہ ہو کر نیچ کے طور پر مطالعہ کرنے لگا - شاعری سے اسے ایک خاص شغف تھا اور ۱۶ سال کی عمر میں جب اس کے سو دو بھے شایع ہوئے تو خزانہ برزہوں نے بینک میں سے اسے گھور کر سر ہلایا اور اس کے روشن مستقبل کی پیشین گوئی کی - اس کے بعد سے اس کے کمالات اور شہرت میں براہِ رقبہ ہوتی آئی ہے - اس کی انگریزی نظموں کا مجموعہ (Silken Passel) انگلینڈ کے اہل نظر سے خراجِ تحسین وصول کر چکا ہے اور دوسرا مجموعہ غالباً وہاں کی (Poetry Society) کی طرف سے شائع ہونے والا ہے - اس کی قومی نظمیوں گجرات کے بچے بچے کی زبان پر ہیں اور گاندھی جی بھی فرصت کے اوقات میں انہیں دھیمے سروں میں گنگنا یا کرتے ہیں! اس کی فلسفیانہ نظموں کا مجموعہ 'درشکا' ذی ہوش لوگوں کے لیے سورمہ بصیرت اور روح پرور بزرگوں کے لیے تفسیر حقیقت ہے - بہر حال اس کا نظریہ زندگی صحیح ہو یا نہ ہو اس کی قادر الکلامی مسام الذہوت ہے -

لیکن فلان کا سرد چنگل ویدانت اور ستیاگرہ سب کے لیے ہے - ایک تخیل ہے جسے کبھی فلان نہیں اور آرتست جب تخیل کے کاغذ پر حسن کی روشنائی اور عشق کے قلم سے انسانیت کے خدوخال بناتا ہے تو ابدیت اس کی تحریر پر دایمی شہرت کی مہر لگا دیتی ہے - ارد شیر خہردار کی وہ نظمیوں ہمیشہ شوق سے پڑھی جائیں گی جن میں وہ اپنے مخصوص انداز میں حسن کی شوخی اور عشق کی وارفتگی کی تصویر کھینچتا ہے -

یہ سچ ہے کہ ارد شیر خہردار کا تغزل یاس و حرمان کے ان جذبات سے نا آشنا ہے جو اردو شاعری کا ایک خاص عنصر ہے، لیکن غور سے دیکھا جائے تو تمام ہندو ادب اس حزنہ (ٹریجک) رنگ سے خالی ہے جو آرت

کی جان ہے۔ اور اسی وجہ سے ہندو شاعری کی معشوقہ ایک ایسی عورت ہے جس کا ملنا اگر آسان نہیں تو دشوار بھی نہیں ہے۔ محرومی کی اذیت کو ہندو شاعر نہیں سمجھ سکتا اس وجہ سے کہ چمسی معاملات میں ہندو سوسائٹی میں ایسے بدنصیب کم ہوتے تھے جو محروم و ناکام رہ جائیں —

لیکن طرب و نشاط کی یہ وارفتگی ملاحظہ ہو کہ ہر لفظ شراب میں ڈوبا ہوا ہے اور ہر بند شاعر کی شان مانی کے ساتھ رقصان و خندان ہے۔ روح (Soul) اور حس (Sense) کا اتحاد کیا کسی معمولی صنّاع کی کاریگری ہو سکتی ہے کہ جب 'ارد شہر' اپنی محبوبہ کی رفتار کا بیان کرتا ہے تو الفاظ گھنگھرو بجانے لگتے ہیں اور جب اس کی گفتار کا ذکر کرتا ہے تو بندشیں اتنی سست و سبک ہو جاتی ہیں گویا پھول جھڑ رہے ہیں گو اس کے جذبات میں وہ تلوع اور ندرت نہیں جو ٹیکور کی امتیازی شان ہے لیکن معنی آفرینی، جدت تخیل اور رنگینی بیان میں وہ اپنے ہم عصر سے آگے بڑھ جاتا ہے —

زمانہ حال میں جب زندگی کی ہلکامہ پروری اور حرفت کی ستم رانی نے آرت کو پسپا کر رکھا ہے اور وہ دن دور معلوم ہوتا ہے جب وہ از سر نو تازہ دم ہو سکے گا تو یہ ملک کم از کم اس اعتبار سے دنیا کے تمام ممالک پر ضرور فوقیت رکھتا ہے کہ آج ایسے بلند مرتبہ شاعر کسی ایک ملک میں موجود نہیں ہیں۔ ارد شہر خبردار انہیں معدودے چند شاعروں میں سے ایک ہے —

یہاں ہم اس کی شاعری کے چند نمونے پیش کرتے ہیں۔ ترجمے میں

شاعر کے جذبات کو صحیح طور سے ادا کرنے کی کوشش کی گئی ہے —

جہاں درِ گل کے فوارے صبح و مسا چلا کرتے ہیں اور اپنے  
 محبت کا گیت | ستارہ جبین قطروں کو ہر طرف بکھیر دیتے ہیں —

جہاں دوشیزہ صبح خوابوں کے تانے بانے سے نور کے تار نکالتی ہے،  
 جہاں گلذاری پردوں کے جھاملاتے ہوئے سایے تل کی طرح سمٹ جاتے ہیں  
 اور مستانہ ہوائیں متحو خرام دھتی ہیں —

جہاں دوج کے چاند کی ملگجی کرنیں غش کھا کر صبح تاباں کے  
 آغوش میں گر پڑتی ہیں —

وہیں، میں ہری ہری دروب پر ناچتی ہوئی دنیا والوں کو اپنے  
 گیت سلواتی ہوں —

جب آفرینش کا سوتا سوکھا ہوا تھا اور دنیا کی بساط ایک بے روح  
 ہیولی سے زیادہ نہ تھی —

جب ہر ذرہ اس شعلے کے انتظار میں دم بخود تھا جس کی لپک  
 جان جہاں بن جائے گی۔۔۔

جب 'زمانہ' اپنی آنکھوں اور کانوں کو بازوؤں سے تھک کر خاموش  
 و مہبوت بیتھا ہوا تھا —

اور حقیقت خوابیدہ اس دور کی تلاش میں حیران تھی جو مدتوں  
 پہلے اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی تھی —

تو — میں نے ایک رسیلا نغمہ چھیڑا اور اے لو، انہیں میرے ہر ہر  
 نقش قدم پر ایک ایک عالم کروت لیغا نظر آیا —

مہری بندسی کی ہر تان ایک چنگاری تھی جس نے رات کے دیپکوں  
 میں جوت جگا دی —

اور سنہرے پردوں کی طرح، مہر و ماہ نے میری مسرت کی نورانی

ملاؤں میں گوندہ کر دنیا کے گلے میں پہنا دی —

میری نواسنجی کے سانچے میں خلد بریں کا کالبد ڈھلا اور وہاں

کے برگ و شجر نے فیر قانی انبساط کا لباس اوڑھ لیا —

اور 'وقت' موسیقار کی طرح آپ اپنی خاکستر سے اتھا کہ میرے

مندر کی آرتی کرے —

اور میرے سرگم کی سیڑھیوں پر چڑھ کر 'حقیقت' میرے حضور میں

سجدہ ریز ہوگئی —

میرا ہر تار نفس بہار کی دلربائیوں کے ساتھ غزل خواں ہے - میں

بادلوں کے چہولے پر چھولتی ہوں، وہ میرے اشاروں پر رقص کرتے ہیں۔

اور میں برشکال کی ہلکی ہلکی پہواری کے ساتھ ناچتی ہوں - کبھی

زمستان کی سرد پتلیوں کے ساتھ میں خاک بسر دھتی ہوں —

اور کبھی بادِ سموم کی ہم رکاب ہو جاتی ہوں —

کبھی برف کے تکرور کے ساتھ زمین پر پھسلنے لگتی ہوں —

کبھی میں دن کی روشنی کے ساتھ آتی ہوں اور کبھی رات کے

ساتھ — وہ رات جو سیلاپوری کی ملکہ ہے —



تیری مسکراہٹ بہالے کی وہ انی ہے جو فولاد کے دل و جگر میں  
تیرا تبسم | بھی سوراخ ڈال دیتی ہے --

وہ دھوپ چھانؤ کی پرچھائیں ہے جو ندی کے سبک رفتار دھارے

کو آئینہ دکھاتی ہے --

تیرا تبسم گلاب کا وہ پھول ہے جس کی پلنکھڑیاں برف پر بکھر گئی ہوں -

جان من! تجھے کیا خبر کہ تیری کرشمہ گری نے 'تبسم' کا پیرایہ

اظہار اختیار کر لیا ہے —

ایک جنبش لب؟ — اور میرے خیالات کا سارا شیرازہ منتشر ہو گیا۔

ایک لرزہ تبسم؟ — میں اس کا اتنا ہی رسیا ہوں جتنا سردیوں

میں سورج کی ایک کرن کا —

ہلکی سی مسکراہٹ؟ — اور مہرا دل آپ اپنی خود فریبیوں کے

دام کا اسیر ہو گیا —

جان من! اس شمع کی لو کو زیادہ نہ اُکسا ورنہ کس کا دیدہ ہے

جو خیرہ نہ ہو جائے —

گرمیوں کی کوئی صبح تیری مسکراہٹ کی دل کشی کو نہ پاسکی

سردیوں کی چاندنی کو لجاجت کا یہ انداز کب میسر ہے؟ شوقِ شام یا

آیا کسی گل خنداں میں یہ بانک پن نہ آیا — نہ آیا —

حسن و جمال کا کوئی مجسمہ قوس قزح کی رنگینیوں کو ہونٹوں

میں گھلا کر یوں فضا میں نہیں بکھیر سکتا —

تہرے تبسم کی ضیا طرازی میں میری چمک جگنو کی طرح ماند پڑ رہی ہے۔

لہہ! ان ہونٹوں اور آنکھوں کو دوسری طرف پھیر لے جلدی ہر جنبش

کے ساتھ جلت کے چراغ جلتے اور بجھتے ہیں۔

تیرا تبسم میری دنیا میں ہلکامہ برپا کر دیتا ہے اور پھر اس کے

بغیر ہر طرف سلاتا ہوتا ہے — سلاتا اور اندھیرا! —

اگر اس دنیا میں کوئی بہشت بن سکتی ہے تو اس کی تخلیق تیرے

ہی تبسم سے ہوگی! میرے سروناز، ایک مرتبہ اسی انداز سے مسکرا دے۔



## (۱) نظارہ

واردات محبت | کف دریا کی طرح سبک اور سفید پھولوں کی سیج سے —  
خواب ناز سے میری محبوبہ یوں بیدار ہوئی گویا گل

صنوبر کی ایک چھتری لچک کر تہلی سے گر پڑی ہو۔

گویا سہلا پوری سے کوئی دیوی اس دنیا میں اتر آئی ہو۔ یا لہلہے  
شب کی گود میں بنت نور مچل اٹھی ہو اور اس کی جلوہ گستری نے زمین  
و آسمان کو شاداں و فرحاں کر دیا ہو —

رات سے کہو کہ بھول جاے اپنے تہمتاے ہوے ستاروں کو اور صبح سے  
کہو کہ بھول جائے اپنے شہمنی اجالے کو۔

سملدر سے پوچھو کہ کیوں یاد کرتا ہے اپنی بیکرانی کو، اور بہار سے پوچھو  
کہ کیوں یاد کرتی ہے اپنی چمن آرائی کو، نہیں بھول سکتا کیا یہ بھول  
اپنی نازک ادائیگی کو، اور کب تک روئے کی زمین ان نو نہالوں کو جو  
ہمیشہ ہمیشہ کے لیے پیوند خاک ہو گئے —

اگر وہ بھول سکتے ہیں تو سب کچھ بھول جائیں کیونکہ دیدار  
محبوب کے بعد شاعر اپنے کیتوں کو بھی بھول رہا ہے۔

دل نواز! یہ جو صداے نغمہ فضا میں گونج رہی ہے —

دراصل ان لہروں کی صداے بازگشت ہے جو تیری روح کے وسیع

سملدر میں اٹکھیلیاں کیا کرتی ہیں۔

ان موتیوں کی چمک میں جو تیرے دل کی گہرائیوں میں سامان

نظارہ مہیا کر رہے ہیں۔



## (۲) حسن

کلی کے لوچ سے پہل رنگ و بو حاصل کرتا ہے اور سیلاب اشک میں مسکراہٹ کی سیپی اجاگر ہوتی ہے۔ رات کی گہری تاریکی میں دنیا ابدیت کے خواب دیکھتی ہے اور قدرت کے ارتقا میں انسان کی قوت پروان چڑھتی ہے۔ زندگی موت کے رتھ پر بیٹھ کر جہاں گشتی کرتی ہے اور کانتوں کے آغوش میں پھول یوں کھلتا ہے جیسے رشک کے آغوش میں عشق! اور جس طرح نور عالم سمت کر آفتاب میں سما جاتا ہے اسی طرح

حسن کے سارے تار میری معبودیہ کے رباب میں اکٹھا ہو جاتے ہیں —

دیکھا ہے کبھی راج ہنس کو تم نے مان سرور میں تیرے ہرے دیکھا ہے کبھی قطرہ کو گہر ہوتے ہوئے؟ برف کو پگھلتے ہوئے؟ اور یا تم نے کوگل کی پتی کی نزاکت کو غور سے دیکھا ہے؟ کسی تیتیری کے پر کبھی تمہارے ہاتھوں پر تھر تھراے ہوں؟ شاعری کے ابدی ترانوں کی گونج کبھی روح کے ساز پر سلی ہے؟ —

خواب میں کوئی پری کبھی تمہیں کوہ قاف اٹھا لے گئی ہے؟ اگر ایسا ہوا ہے — تو تم میری معبودیہ کی نزاکت، ملاحت اور لطافت کا اندازہ لگا سکتے ہو — جو آب حیات سے زیادہ لطیف، کدول سے زیادہ ملیح، اور چھوٹی موٹی سے زیادہ نازک ہے۔ میری معبودیہ جازوں کی چاندنی کی طرح سیمیں اور چودھویں کے چاند کی طرح خنداں و فرحان ہے۔

وہ امرت کے لب ریز پیالے کی طرح جوانی کے دس میں شرابورہ کاش میں وہ ساغر ہوتا جس میں یہ شراب شباب تہالی گئی ہے تو میں اسے اپنی رگوں میں اس طرح حلول کر لیتا کہ ایک قطرہ بھی چھلک کر نہ گر سکتا۔

## (۳) نشاط

سنوار نکھار کے بعد میری محبوبہ گل شگفتہ کی طرح آغوش  
کشودہ ہو جاتی ہے -

دور سے میرے نہیں حریص بھونرے کی طرح اس کے دس کو چکھنے  
کے لیے ابرؤں کے پر تولنے لگتے ہیں -

پھر میں کوشش کرتا ہوں کہ اپنی ملتجی آنکھوں کی دَور سے پتنگ  
کی طرح اسے اپنی طرف کھینچ لوں -

لیکن یہ دیکھو وہ نہیں پڑی - اور چشم زدن میں دَور کت گئی  
اور پتنگ پھر ہوا میں ارنے لگی -

اپنی سپیلیوں کے ساتھ وہ تالاب میں جل کلیل کرتی اور تھک کر  
کنارے پر بیٹھ جاتی ہے -

جب وہ جوڑا کھول کر پانی میں اپنے پاؤں لٹکا دیتی ہے تو معلوم ہوتا  
ہے کہ عروس شام نے مشرق کی ساری رنگینیاں چرائی ہیں -

اور جب وہ اپنے گلے میں کلول کے دانتھلوں کی مالا ڈال لیتی ہے  
تو گمان ہوتا ہے کہ سنگ مرمر کے ایک بت پر کیوپتہ نقش و نگار بنا رہا ہے -

جب وہ پانی میں مدہ دیکھتی ہے تو گویا چاند فرش آب پر کلول  
کے جھولے میں جھولنے لگتا ہے -

سورج کو اس لیے پوجتا ہوں کہ اس میں عظمت ہے اور آگ کو اس  
لیے کہ اس میں روشنی ہے -

چاند کو اس لیے پوجتا ہوں کہ اس میں حسن ہے اور دریا کو اس  
لیے کہ وہ غیر فانی ہے -

بادل کو اس لیے پوجتا ہوں کہ وہ کبھی گر جتا ہے ، کبھی برستا ہے

اور کبھی کھل جاتا ہے —

اور ہوا کو اس لئے کہ وہ کبھی آندھی بن جاتی ہے اور کبھی نسیم و شمیم -  
کھوں نہ ان دیوتاؤں کو چھوڑ کر ایک اپنی محبوبہ کی پرستش

کروں جس میں یہ سب صفات موجود ہیں —

وہ سورج بننا چاہے تو واللہ میں آسمان بن جاؤں —

اور وہ بجلی بنے تو میں بادل بن جاؤں —

وہ کوئل بنے تو میں آم کی قال بن جاؤں اور وہ مرلی ہونا چاہے

تو میں 'کشن' بن کر اسے ہونٹوں سے لگالوں —

وہ سمندر بنے تو میں ساحل ہو جاؤں —

اور وہ پھول بنے تو میں بھونرا بن کر ہمیشہ اس کے کانوں میں

سر گوشیاں کروں —

الہی! مجھے حیات دارین عطا کر کہ میری محبت کا چراغ ہمیشہ روشن رہے -

وہ دیکھو، وہ جان جاں، وہ بلند حیات، وہ دل کی کلی ادھر آ رہی

ہے - میرے پاس ہزار جانیں ہوتیں تو سب کو اس کی ایک لغزش مستانہ

پر نثار کر دیتا —

وہ آ رہی ہے — ایک سر جوش لہر کی طرح جو میرے دل سے ایک

میتھے راگ کی طرح ٹکرا جاتی ہے —

میں ایک بت سلگیں تھا جسے اس کی ایک تھوکر نے 'اہلیا' کی

طرح زندہ کر دیا —

اعجاز مسیحا پر کیوں نہ ایمان لاؤں کہ خود بھی تو ایک فسوں

طراز کا جلایا ہوا ہوں —

## (۴) پوجا

نہ آفتاب تھا اور نہ ماہ تاب --- ایک تیرا ہی جلوہ تھا —  
 نہ سلسلہ تھا اور نہ ساحل --- زمین سے آسمان تک تیرے سوا کچھ نہ تھا —  
 نہ جلوں تھا نہ عقل --- فہم و وہم سب تیرے کرشمے تھے —  
 نہ پرواز تھی نہ رفعت --- فضا تیری تھی ' صبا تیری تھی —  
 نہ تو آسمان میں تھی اور نہ زمین میں — تو محبت کے 'زن کھتولے  
 پر بیٹھ کر ایتھر کی چادروں میں لہراتی دھتی تھی —

## (۵) بے بسی

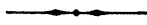
عشق کا بندہ ہوتے ہوئے بھی یہ کہنے کی جرات نہیں ہوتی کہ میں  
 اس کی حقیقت کو پا گیا —  
 اس کی ایک آنکھ تبسم بہ کنار اور دوسری اشک بار ہے — اس کے  
 ایک ہاتھ میں روشنی اور دوسرے میں تاریکی ہے —  
 وہ آگ، سے زیادہ گرم اور برف سے زیادہ سرد ہے — وہ زندگی ' خواب  
 اور موت کا حسین ترین امتزاج ہے — اس کا سر بہشت بریں میں ہے تو پائوں  
 تخت الثریٰ میں —

مجھے یہ کہنا چاہیے کہ میں محبت سے ناواقف ہوں لیکن اس کی  
 عینک سے تجھے پہچان گیا ہوں —

کبھی کبھی مہری آنکھوں میں آنسوؤں کا سیلاب اُمٹ آتا ہے اور میں  
 سوچتا رہ جاتا ہوں کہ حدیث عشق کی تفسیر یہی تو نہیں ہے —  
 وہ ہمارے آنسو ہیں جو آسمان پر جم کر ستارے بن گئے ہیں —  
 جان من، زمین آسمان کی دی ہوئی بارش کے معاوضے میں کہوں

نہ ہمارے آنسوؤں کی جھڑی کا منہ اوپر کی طرف پھیر دے اور ان کے ساتھ  
 اوپر چڑھ کر میری روح جنت کی رنگینوں میں تحلیل ہو جائے —  
 آفتاب صبح اس لیے طلوع ہوتا ہے کہ شام کو غروب ہو جائے —  
 لیکن محبت کا آتش کدہ ایک مرتبہ بھڑک کر کبھی نہیں بجھتا -  
 ستاروں کے پھول اس لیے کھلتے ہیں کہ مرجھا جائیں لیکن آسمان کا گل  
 کدہ سدا بہار ہے —

جب مہ و انجم نوا محترم سروں میں بہاگ گاتے ہیں تو او خدائے  
 محبت! میں سمجھتا جاتا ہوں کہ درد کی انتہا یہ ہے کہ دوا ہو جائے —



#### (۶) ہوش

ایک مرتبہ میری کشتی بہنور میں پڑ گئی، اس کے مستول اور باد بان  
 توت کر پانی میں گر گئے اور لنگر بھی بہہ گیا —  
 کسی گم دیدہ مسافر کی طرح گمراہ ہو کر یہ ناؤ منجدھار میں یوں  
 چہرنا و غلطاں چکر کات رہی ہے کہ سمت و ساحل دور سے اسے دیکھ کر ہنس رہے ہیں -  
 اور اسی خستہ حالی میں کیا دیکھتا ہوں کہ افق پر سورج ندی سے  
 نہا کر نکلا اور ایک سنہری کشتی بام فلک پر ہریدا ہوئی —  
 نہنگ آسا موجوں میں پھنس کر میری نڈھی سی ناؤ تلکے کی طرح  
 کبھی ڈوبتی ہے، کبھی ابھرتی ہے -- کیا معلوم کہ ناخدا میری خبر  
 لے گا یا نہیں —

آج جو میری محبوبہ اُداس ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ خدا نے اپنے  
 دیاکار بندوں کا سوگ لیا ہے —

اس کے ہونٹوں پر تبسم بے جان ہو کر تڑپ رہا ہے اور یہ محسوس

ہوتا ہے کہ آسمان پر بادل گھر تو آئے ہیں لیکن نہ وہ برسکتے ہیں اور نہ کھلتے ہیں۔ نہ ان میں بجلی توڑتی ہے۔

آہ، مجھے غم زدہ کی جانت سونی ہو رہی ہے مہری بے نور آنکھوں کا کاجل دھل رہا ہے۔

میں نے کائنات کا ہر ذرہ چھان مارا لیکن مہری مایۂ حیات کہیں نہ ملی۔ میں ازل اور ابد کے سروں کو دیکھ آیا۔ اور تخت الثریٰ کی عمیق گہرائیوں تک پہنچ گیا۔ آفتاب کی آتشیں زلنوں کو کمنڈ بنا کر میں اس غار میں اترا جہاں تاریکی اور تنہائی، دو بھلیں دھتی ہیں۔ لیکن وہ مشام جاں کہیں نہ ملی اور میرے گیتوں کے ذیلے توت کر ہوا میں منتشر ہو گئے۔

### (۷) گاموانی

او مرغ خوش الحان، تو ہمیشہ سر بلند پہاڑیوں کی سیر کرتا رہا ہے۔ اب نیچے اتر اور وادیوں کو بھی اپنے نغموں سے زمزمہ ریز کر دے۔ تو ہمیشہ عظمت و رفعت کا جوہا رہا ہے۔

آ، اور میدان کی وسعت کو بھی ایک نظر دیکھ جا۔

ان بدلیوں میں پانی ہے تو ان برساتی ندیوں کی اٹھتی جوانی بھی کچھ کم تسکین بخش نہیں۔

آ، میرے نغمہ گر اور اپنے میٹھے بولوں سے ان میدانوں میں امرت کی دھار بہا دے۔

درد نا آشنا ساحل کو ملانے کے لیے سمندر روز اس کی خدمت میں جل پریوں کے غول بھیجا کرتا ہے۔

وہ کبھی ہلکے سروں میں گاتی ہیں، کبھی آنسوؤں سے اس کے پھر  
 دھوتی ہیں، کبھی اس کی سنگ دلی پر کھج کر چوخ اٹھتی ہیں —  
 یہ ساحل کبھی نہ پسپجیکا — اور ایک دن وہ آئے گا کہ مدوجزر  
 کا طوفان اس کے بلند بلند توڑ دیتا —

پیداری، اسی طرح دریائے محبت میں طوفان اٹھنے والا ہے جو تجھے  
 اپنے آغوش میں ہمیشہ کے لیے چھپا لے گا —  
 محبت کے دیلوں پر بیٹھ کر میں اندھیرے میں ازا کرنا ہوں -  
 میں صرف ایک گیت گاتا ہوں، میرے ساز میں صرف ایک راگ ہے،  
 ایک تان ہے، ایک سر ہے —

میں صرف ایک خواب دیکھتا ہوں —  
 میں نے سب دیوتاؤں کے مندر توڑ کر ایک مندر کھڑا کیا ہے جس  
 کا نام ہے — پریم مندر —

میرے لیے سارے الفاظ کے معنی صرف ایک لفظ میں سمٹ آئے ہیں - پریم -

### الوداع

میرے گیت، جا اور آسمان پر وہ ساز چھیڑ کہ ستارے توت کر  
 گر پڑیں اور تیری ایک ایک تان اس کی جگہ لے لے، حتیٰ کہ تو سارے  
 فلک پر چھا جائے - اب تک تو نازک پردوں کی لچک دار تہینوں پر  
 نواریز رہا اور یا مہری چھوڑی میں بیٹھ کر نوحہ خوانی کرتا رہا —  
 اب جا اور اس آسمانی ملک کو اپنی سحر نوائی سے مدھوش کر  
 دے جو گوش بر آواز تیرا، منتظر ہے —

## باد آگ کھین

### غزلیات اشرف

اشرف، ولی کے معاصرین میں خاص درجہ رکھتا ہے۔ ولی اور اس کے معاصرین نے اپنے کلام میں اس کا ذکر کیا ہے۔ ولی کا شعر ہے :-

اشرف کا یو مصراع ولی متجکوں ہے دلچسپ

الفت ہے دل و جاں کوں پیرے پیم نگرسوں

اشرف نے بھی ولی کا ذکر کیا ہے —

کرتا ہے یو مصراع ولی سید دل اشرف

پور مری خبر لینے رو صیاد نہ آیا

ان اشعار سے اشرف کا معاصر ولی ہونا ثابت ہے۔ ایک اور ثبوت

ان کی معاشرت کا ہے ولی نے اپنے کلام میں سید ابوالمعالی نامی

سید زادے کا ذکر کیا ہے اور بقول قائم اس کے ساتھ ۱۱۱۲ھ میں دہلی

کا سفر بھی کیا تھا۔ قائم لکھتا ہے —

”درستہ چہل و چہار از جلوس عالم گیر ہمراہ سید ابوالمعالی نام سید،

پسرے کہ دلش فریفتہ او بود پشاه جہاں آباد آمد“ —

اشرف نے بھی سید معالی کے حسن و جمال کی تعریف میں ایک پوری

ہزل لکھی ہے اور متفرق اشعار میں اس کا ذکر کیا ہے، اس کا ایک شعر ہے —

معالی حسن میں سب سوں بڑا ہے اسے دیکھن کون کئی عالم کہتا ہے  
 شہیق نے اشرف کو معاصرِ ولی لکھا ہے لیکن حمید اورنگ آبادی نے  
 اس کو ”بلا واسطہ شاگردِ ولی“ لکھا ہے۔ حمید کا مدعا غالباً یہ ہے کہ  
 اشرف باضابطہ شاگردِ ولی تو نہ تھا لیکن اس کے کلام سے فیض اٹھا یا ہے۔  
 شاید ایسا ہو۔ لیکن اب تک نہ تو کسی تحریر سے یا خود اشرف یا ولی کے کلام سے  
 ان کے استاد و شاگرد ہو نے کا ثبوت ملتا ہے۔ بہر حال معاصرتِ مسلم ہے۔ ولی نے ۱۱۱۹ھ  
 میں انتقال کیا ہے لیکن اشرف فرخ سیر کے زمانے تک زندہ رہا۔ سید معالی کی تعریف  
 میں اس کا ایک شعر ہے جس میں فرخ سیر کا ذکر استعارتاً کیا ہے —

جگت کے خو برو سارے نہ ہونیں کیوں حکم میں اس کے

دیارِ حسن میں فرخ سیر سید معالی ہے

حمید نے اشرف کو گجراتی لکھا ہے لیکن اس بیان کے سوا کوئی اور شہادت  
 یا سند اس کے گجراتی ہونے کی نہیں ملتی ہے البتہ اس نے اپنے کلام میں  
 گجرات کے بزرگ شاہ عالم کا ذکر کیا ہے اور ان سے عقیدت ظاہر کی ہے —  
 پھر اشرف کے شاہ عالم ہیں خلف الصدق سید اقطاب  
 مجھ سے عاصی کون کٹیں نہیں پڑا مگر ان کی جذبات فیض مآب  
 یہ عجیب بات ہے کہ جس طرح ولی نے اپنے آپ کو ”شاعرِ ملک  
 دکن“ لکھا ہے اس طرح اشرف نے گجرات کا ذکر نہیں کیا بلکہ اپنے  
 شعر کی داد شاعرانِ دکن سے طلب کی ہے۔ حمید کے تذکرے میں اس کی  
 فزل ہے جس کا مقطع ہے —

یہ شعر سن کے کہے ہیں صد آفریں اشرف

تمام شاعرِ ملک دکن، سخن کی قسم

اشرف کے حالات ابھی تک روشنی میں نہیں آئے ہیں۔ حمید نے اس

کا نام محمد اشرف لکھا ہے لیکن انجمن ترقی و اردو کے کتاب خانے میں اس کا جو دیوان ۱۱۲۹ھ میں محمد بدیع الزماں کا لکھا ہوا ہے اس میں اس کا نام جبکہ جبکہ ”اشرف الموسوی المدنی الشاہی“ تحریر ہوا ہے۔ یہ دیوان انجمن کو سورت میں دستیاب ہوا ہے۔ سنی المذہب تھا۔ اس لیے کہ شاہ عالم کجراتی سے عقیدت رکھتا تھا اس کے سوا اس کا ایک شعر ہے —

اخلاص سوں نظر کر اے صاحب بصیرت

ہر چار یار حضرت تمثیل چار قل ہے

شہیدان کربلا اور اہل بیت سے بھی خاص محبت رکھتا تھا۔ اس نے کئی مرتبے لکھے ہیں چند اس کے دیوان میں بھی ہیں۔ اس کے دیوان کے حاشیے پر رضی، صالح اور فراقی کی غزلوں ہیں۔ فراقی کا ذکر ولی نے اپنے اشعار میں کیا ہے۔ اشرف نے رضی کا ذکر کیا ہے۔ اس کے دو شعر نقل کئے جاتے ہیں جن میں رضی کا ذکر ہے —

اس مصرع رضی کا اشرف ہے دل سوں بھو کا

بے غم ہمارے غم کوں کہا تا نہیں سبب کیا

یاد کر اشرف یو مصراع رضی مصحف کل کا سبق باہل پڑے

حمید نے رضی کو معاصر اشرف اور شاگرد ولی بتایا ہے۔ رضی، ولی کا شاگرد ہو یا نہ ہو لیکن معاصر اشرف تو ضرور تھا اور اس طرح فراقی اور صالح بھی اس کے ہم عصر تھے۔

اشرف کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ پختہ گو شاعر تھا۔ کلام کا عام رنگ بھی وہی ہے جو ولی کے کلام کا ہے۔ اپنے زمانے میں اس کو اچھی

خاصی شہرت حاصل تھی۔ حمید نے لکھا ہے —

طبع رنگینے داشت - شعرش در نواح کجرات شہرت دارد و

دیوان لطیف تصنیف نمودہ —

اشرف کے کلام کی ایک خصوصیت کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے جو  
 بُنی کے کلام میں بھی نمایاں ہے - ولی نے اپنے اشعار میں امرت لال ،  
 گوہند لال ، محمد یار خان ، سید ابوالسعالی کے حسن و جمال کی بڑی تعریف کی  
 ہے - اس طرح اشرف نے بھی عظمت اللہ ، ظفر خاں اور سید معالی کے حسن  
 کی تعریف کی ہے ، سید معالی کی تعریف کا اوپر ذکر ہو چکا ہے - دو علیحدہ  
 غزلوں میں عظمت اللہ اور ظفر خاں کی تعریف لکھی ہے یہاں ایک ایک دو دو  
 شعر نقل کیے جاتے ہیں —

عظمت اللہ بسکہ ہے پیارا جیوا پس کا مہں اس اُپر وارا

ظفر خاں گلشن ناز و ادا بدہل دل اس اُپر ہے مبتلا  
 گرچہ ہے افغان پسر و ناز نہیں ہے ادا اس کی اداے میرزا

انجمن کے نسخے سے اشرف کی چند غزلوں نقل کی جاتی ہیں جن سے  
 اس کی شاعری کا انداز معلوم ہوگا - (چ)

جب سجن مکہ اُپر نقاب کیا چشم عاشق کون جوں سحاب کیا  
 جو پیا ہے پیا کے لب کی شراب نُقل خاطر جگر کباب کیا  
 آشنا اس کے بصر حسن سستی مہں افس دل کون جھوں حباب کیا  
 تب سین ہوں غرق بصر درد و الم جب سین اس شوح نے عتاب کیا  
 تجھہ جدائی مہں چشم اشرف سوں جوش دریاے خون ناب کیا

قد موزوں نے اس کے کام کیا سرو رعنا کون پائے نام کیا

پاے تا سرھے بسکہ صورت ناز      کس ادا سوں دیکھو سلام کیا  
 ساغر مست چشم ساقی سوں      نشاء عشق میں مدام کیا  
 خضر وقت اس کوں بولڈاھے بجایا      جس سوں امرت بچن کلام کیا  
 مشرق مکہہ پہ کھول زلفاں کوں      صبح کے بیچ وقت شام کیا  
 نیم بسمل تھا تیغ نازستی      نگہ شوق نے نسام کیا  
 تب سوں ہے سرو باغ میں پایلد      جب سوں و و سرو قد خرام کیا  
 تجھے جدائی میں خراب راحت کوں      میں ایس کے اُپر حرام کیا  
 بسکہ اشرف اُپر ہے فضل خدا  
 صف عشاق میں امام کیا

اے ہوش رہا سندر مجھے پاس تک آتے جا  
 رشتے کوں محبت کے بازو پہ بڈھاتے جا

یوں دل ملیں ہے خواہش تجھے گھر کی طرت آؤں  
 تک ناؤں بتاتے جا یا تہاؤں بتاتے جا

دیدار سستی اپنے، محروم نہ رکھے مجکوں  
 انچل کوں اٹھا مکہہ سوں تک درس دیکھاتے جا

مغرور نکو ہو توں اس حسن پہ اے ناداں  
 یو سب ہے فدا آخر کین بی کتاتے جا

لاگی ہے نظر جن کی اے رشک پری تجھے کوں  
 دو بیم کے اچھر سوں ان پاس چھواتے جا

کر رام ! تا مجکوں مشتاق ہو آیا ہوں  
 تک رام کلی مہانے یک تان سناتے جا

اے گان ادا سندر اشرف ہے ترا طالب  
 تک پہار سستی اس کوں چھاتی سوں لگاتے جا

عشق تیرے میں بسکہ ہوں بیتاب      بیقراری ہے دل کوں جیوں سیلاب  
 تجھے جدائی میں خواب آوے نہیں      گر مہیا ہو بستر سنجاب  
 نکتہ خال کوں و ر بوجہا ہے      جس نے تجھے حسن کی دیکھیا ہے کتاب  
 تجھے جبین پر عرق کی بوندیاں دیکھے      شرم سوں گومراں ہوئے ہیں آب  
 حسن تیرے کی جھلجھلات کوں دیکھے      پردۂ ابر میں چھپیا مہتاب  
 دیکھے تجھے حسن شعلہ خیز کوں شمع      اشک سوں جل ہوئی ہے گل گل آب

بیگ دی سوں خبر لے اشرف کی  
 تجھے پرت میں ہے بوختور و بے خواب

تجھے دھان کا العدم سوں غنچۂ گل ہے خجبل  
 تجھے لب میگوں کی کیفیت انگے مل ہے خجبل

عشق نے جب سوں مرے دل کے چمن میں گل کیا  
 بوستان عاشقی میں تب سوں بلبل ہے خجبل

نغمۂ مطرب ہے از بس نشاء بخش اس بزم میں  
 شہشۂ خالی نمن آواز قائل ہے خجبل

نوحطائ کے حسن کے دریا سہیں ہوں میں آشنا  
 موج خط غدیریں سوں ان کی کاکل ہے خجبل

گل رخاں کے حسن سوں از بسکہ ہے رشک ارم  
 سر زمیں ہند سوں کشمیر و کابل ہے خجبل

پیچ و تاب زلف شبرنگ پری کوں دیکھے کر  
 دامن دشت پریشانی میں سنبھل ہے خجبل

گلشن اشعار اشرف بسکہ ہے رنگیں بہار  
 عندلیب طالب گلزار آمل ہے خجبل

ہے تجھے حسن کے وصف کا جب سوں بیاں مجھے  
 کہتے ہیں تم سوں اہل سخن درفشاں مجھے  
 لکھتا ہوں مو قلم سوں ایس ضعف کا بیاں  
 از بسکہ ہے تصورِ نازک میاں مجھے  
 رشک یمن کیا ہے دل اس رشک مہر نے  
 اپنے عتیق لب پہ دیکھا رنگ یاں مجھے  
 اشرف ہوں دردِ عشق سوں ہمرنگ کہر با  
 کیتا ہے بسکہ کاہ نمین ناتواں مجھے

دیکھیا ہے جب سوں ووشہ ابرو کماں مجھے کیتا ہے اپنے تہر نگہ کا نشان مجھے  
 جیوں برق جلوہ گر ہو گیا ہے سیند وار ووشہ سوار تازی آتش عنان مجھے  
 عاشق کے حق ملیں دیکھو کیا ناز شوخ ہے ماریا نگاہ تیز سوں دلبر سڈان مجھے  
 آزاد دیکھے زلف چلیپا کی موج (سوں) زنجہر بی کہا ہے سہی قامتان مجھے  
 رکھتا ہوں آہ تیشہ فرہاد کوہکن ہے جب سوں عشق خسرو شہریں زباں مجھے  
 دقت نہت ہے نت مرے نازک سخن ملیں سر مشق فکر جب سوں ہے وو مو میاں مجھے  
 اس شمع رو کی جب سوں ہے اشرف مجھے لکن پروانہ ساں نہیں ہے کدھیں خوف جاں مجھے

# تبرک

## تاریخ و سیر

۶۱۴	حیات مسعودی	۵۹۱
۶۱۵	تذکرہ معصن	۵۹۵
۶۱۶	انقلاب فرانس	۵۹۶

## متفرقات

۶۱۹	مدارس صوبہ متوسط و برادر کا درسی سلسلہ	۵۹۸ ۵۹۸
-----	---	------------

## اردو کے جدید رسالے

۶۲۰	انہس	۶۰۰
۶۲۰	صبح امید	۶۰۲
۶۲۱	اولڈ علیکیرین	۶۰۵

## خاص نمبر

۶۲۲	ہمایون کا روسی ادب نمبر	۶۱۳
-----	-------------------------	-----

## ادب

۵۹۱	دریائے لطافت
۵۹۵	نکات الشعرا
۵۹۶	دیوان تابان
۵۹۷	حامد کے سو شعر
۵۹۸	حضرت احمق کے سوا سو شعر
۵۹۸	صہبائے ولا - جوش ولا
۵۹۹	اتالہق الصبیان
۶۰۰	مرقع سخن
۶۰۲	سلسبیل
۶۰۵	خمستان
۶۱۰	سودیشی اردو - ضروری کہانیاں
۶۱۲	ملتخب افسانے
۶۱۳	لال قلعہ کی ایک چھلک



# تبصرے ادب

## دریائے لطافت

مطبوعہ و شایع کردہ انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن - صفحات  
مع مقدمات وغیرہ سوا چار سو - کاغذ، طباعت وغیرہ عمدہ - قیمت  
مجلد تین روپے غیر مجلد دو روپے آٹھ آنے

یہ اردو زبان کے نامور شاعر سید انشاللہ خان انشا کی تالیف ہے۔  
جس میں اردو صرف و نحو، منطق، عروض و قافیہ اور معانی و بیان سے بحث  
کی گئی ہے۔ اس کے دو حصے ہیں۔ پہلے حصے میں صرف و نحو کا بیان ہے۔  
یہ سید انشا کی تصنیف ہے۔ دوسرا حصہ جس میں منطق، عروض وغیرہ  
سے بحث کی گئی ہے مرزا قتیل کی تالیف ہے۔ پہلا حصہ کتاب کی جان  
ہے۔ اس میں اردو کے قواعد، محاورات اور روزمرہ پر نہایت تحقیق  
اور خاص اصول و ترتیب کے ساتھ بحث کی ہے۔ اور تمام مسائل پر  
محققانہ اور نائدانہ روشنی ڈالی ہے۔ سید انشا چونکہ ہمدستان کی

مختلف زبانوں سے بخوبی واقف تھے، دہلی (جو اس زمانے میں فصاحت اردو کا گہوارہ تھی) کی شاعری کے خاص علم بردار تھے، اور لکھنؤ کے جدید دور شاعری کے بنانے میں بھی شریک تھے اس لیے ان مقامات کی زبان کے فرق اور خصوصاً دہلی کے محلے محلے کی زبان کی خصوصیات سے بخوبی واقف تھے۔ انہوں نے ہر محلے، طبقے اور پیشے کی زبان کی خصوصیات اور ان کے باہمی اختلافات کو بڑی باریک نظری سے دکھایا ہے۔ اس کے سوا ہندوستان کے مختلف صوبوں کی بولیوں سے بھی بحث کی ہے۔ اپنی تحقیق سے زبان کے ایسے قواعد منضبط کیے ہیں کہ وہ آج تک کم و بیش برقرار ہیں۔ کتاب کے وہ حصے خاص طور سے دلچسپ ہیں جن میں سید انشا نے کسی خاص محلے، طبقے، پیشے یا صوبے کے محاورے یا روزمرہ کو فصیح یا غیر فصیح یا کسی قاعدہ کو صحیح یا غیر صحیح اور مستند یا غیر مستند قرار دیا ہے۔ ایسی اکثر باتیں وہ اپنے ذوق کی بنا پر لکھ گئے ہیں۔ بے شبہ ان میں سے اکثر آج تک وہی مروج ہیں اور تسلیم کیے جاتے ہیں جن کے حق میں انشا نے اپنے ذوق کی بنا پر فیصلہ کیا تھا، لیکن بعض محاورے، الفاظ اور قواعد ایسے بھی ہیں جو سید انشا کی نظر میں غلط، غیر فصیح یا غیر مستند تھے لیکن آج وہ صحیح، اور فصیح اور مستند ہو گئے ہیں۔ یہ چیزیں لسانیات کے طالب کے لیے خاص دلچسپی کا باعث ہیں۔ اسی طرح انشا نے بعض اساتذہ پر تنقید کی ہے۔ ایک اعتراض مرزا سودا پر یہ کیا ہے کہ وہ ”لہک، جھپک والے قصیدے میں کتک بمعنی لشکر محض قافیے کی ضرورت سے استعمال کر گئے ہیں.....۔ کتک ہرگز اردو کا لفظ نہیں“۔ اس کے ثبوت میں ایک تو سکندر کا مارواڑی زبان کا مرثیہ پیش کیا ہے اور دوسری سند بخت سذکھ مارواڑی کی نثر سے پیش کی ہے۔ انشا نے یہ

عجیب بات لکھی ہے - کتک سنسکرت زبان کا لفظ ہے اور ہندوستان کے مختلف صوبوں کی بولیوں میں وہیں سے آیا ہے - قدیم اردو شاعروں نے بھی اس لفظ کو استعمال کیا ہے چنانچہ سودا اور سکندر سے تقریباً ایک سو سال قبل نصرتی نے بھی اس لفظ کا استعمال کیا ہے - اس کے سوا قدیم اردو لغت کی کتابوں میں بھی یہ لفظ پایا جاتا ہے - ایسی صورت میں اس کو خالص مارواڑی زبان کا لفظ کہنا صحیح نہیں -

دریائے لطافت میں کئی ایسی باتیں موجود ہیں جن پر بحث مباحثہ اور گفتگو کی ضرورت ہے - زبان و ادب کے طالبوں کے لیے یہ بہت بڑا سرمایہ ہے ان کو ضرور اس کا مطالعہ کرنا چاہیے - اس سے زبان و ادب کے عجیب و غریب نکات ہاتھ آتے ہیں -

یہ کتاب ۱۸۰۸ ع میں لکھی گئی تھی جب کہ جدید مغربی علم ادب کی پرچھائیں ہماری ادبیات پر نہیں پڑی تھیں اور ہمارے شاعروں اور ادیبوں کو مغربی خیالات اور تحقیق و تلیقہ کی ہوا تک نہیں لگی تھی لیکن سید انشا کی سلامت ذوق اور باریک نظری کی داد دینی پڑتی ہے کہ انہوں نے تحقیق و تلیقہ کا وہ راستہ اختیار کیا کہ ان کے پودا کیے ہوئے مباحث اور طریق تحقیق میں وہی تازگی اور جدت برقرار ہے -

لیکن عجیب بات ہے کہ اس قدر اہم کتاب قدر دانی اور مقبولیت سے محروم رہی - اس کے دو سبب معلوم ہوتے ہیں ایک تو یہ کہ ہمارا ذوق ادب اتنا ترقی یافتہ نہ تھا - دوسرا یہ کہ یہ کتاب بلحاظ مطالعہ سہولت بخش نہ تھی - اس میں بعض جہتیں ایسی تھیں کہ ان سے لطف و آسانی کی بجائے الجھن اور دشواری پیش آتی تھی - مثلاً انہوں نے اپنے ولی نعمت نواب سعادت علی خان کے اوصاف کی رعایت سے حروف کے

نام بھی عجیب فریب رکھے تھے - الف کو وہ اقبال اور ”ب“ کو بخشش لکھتے تھے و علیٰ ہذا - الف بے کی سادگی کے مقابلے میں اقبال، بخشش وغیرہ ظاہر ہے کہ کس قدر دشواریاں پیدا کرتے ہوں گے اور قاری کو الجھن میں ڈال دیتے ہوں گے -

مولوی عبداللحق صاحب مدظلہ نے ۱۹۱۶ ع میں اس کے غیر ضروری اجزا کو حذف کر کے اور طولانی، غیر واضح اور دقت طلب عنوانات وغیرہ کو بدل کر مرتب کیا تھا اور انجمن ترقی اردو کی طرف سے شایع کیا تھا۔ یہ سہولت بہم پہنچانے کے بعد بھی اس کی خاطر خواہ قدر نہیں ہوئی غالباً اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ کتاب فارسی زبان میں ہے جس سے ہر شخص بآسانی مستفید نہیں ہو سکتا۔ اس کے افادے کو عام کرنے کی غرض سے انجمن نے اس کا ترجمہ کرایا ہے۔ ترجمہ اردو زبان کے نامور اور مستند ادیب و شاعر پنڈت برجموہن دتا تریہ کیفی نے فرمایا ہے۔ ترجمہ نہایت سلیس، پاکیزہ اور صحیح ہے۔ لایق مترجم نے جگہ جگہ حواشی بھی درج کیے ہیں اور متن کتاب میں بھی توضیحی عبارتیں داخل کی ہیں جن کو مصنف کی عبارت سے میسر کرنے کے لیے قوسین میں درج کیا گیا ہے۔ کتاب کے شروع میں ایک بہت تفصیلی فہرست ہے جو اندکس کا حکم رکھتی ہے۔ اس کی مدد سے کتاب کے تمام مطالب و مضامین کا حال بہت جلد معلوم ہو جاتا ہے اور ہر چیز آسانی سے مل جاتی ہے۔ انجمن نے یہ ادیشن شایع کر کے سید انشا کی عالمانہ تحقیقات کو ہر اردو داں کے لیے عام کر دیا ہے -

## نکات الشعرا

تالیف میر تقی میر مطبوعہ و شایع کردہ انجمن ترقیء اردو اورنگ آباد دکن - صفحات علاوہ مقدمہ و اشاریہ ۱۸۰ - کاغذ طباعت وغیرہ عمدہ اور دیدہ زیب - قیمت مجلد اردو پے چار آنے فہر مجلد ایک روپیہ بارہ آنے —

جو لوگ اردو زبان کی تاریخ سے دلچسپی رکھتے ہیں وہ میر کے تذکرہ نکات الشعرا کی اہمیت کو بخوبی جانتے ہیں - یہ اردو شاعروں کے اولین تذکروں میں ہے اور چونکہ ایک مشہور، مستند اور بلند پایہ استاد کا لکھا ہوا ہے اس لیے خاص اہمیت و حیثیت رکھتا ہے - اس میں ایک سو چار شاعروں کا تذکرہ ہے - گو یہ مختصر ہے لیکن اس میں بہت سی کام کی اور مفید باتیں ملتی ہیں اور ایسے تاریخی اشارے اور ادبی نکات ملتے ہیں جو دوسری جگہ نہیں مل سکتے - میر صاحب نے بڑی تحقیق سے لکھا ہے اور شعرا کا معیاری کلام انتخاب کیا ہے اور جگہ جگہ بڑی استادانہ تلقیدیں کی ہیں - یہ تذکرہ عمدہ اشعار کا انتخاب بھی ہے جس سے عام ناظرین لطف اندوز اور میر کے ذوق سے آشنا ہو سکتے ہیں اور شاعروں کے حالات کا مجموعہ بھی، جس سے تاریخ ادب کے شائقین مستفید ہو سکتے ہیں - اور چونکہ اس میں میر نے بڑی آزادی اور بے باکی سے شاعروں کے کلام پر تلقید اور رائے زنی کی ہے اس لیے یہ تلقید کا بھی عمدہ نمونہ ہے —

اس تذکرے میں اکثر ان شاعروں کا حال ہے جن سے مصلف ذاتی ملاقات اور واقفیت رکھتا تھا، اس لیے اس میں اکثر مستند اور محققانہ

چیڑیں ملتی ہیں۔ مصنف نے شمالی ہند کے شاعروں کے ساتھ دکنی اور کجراتی شاعروں کو بھی لیا ہے۔ اس باب میں مصنف نے عزت کی بیاض سے استفادہ کیا ہے۔ کہیں کہیں دکنی شاعروں کے حالات اور اسما و نیرہ میں فرورگذاشتیں نظر آتی ہیں، ان کی تصحیح حواشی میں کر دی گئی ہے، جس سے تذکرہ کا پایہ استناد زیادہ بلند ہو گیا ہے۔

اس سے قبل انجمن ترقی اردو نے اس تذکرے کو شایع کیا تھا لیکن پہلے ادیشن میں متعدد غلطیاں رہ گئی تھیں۔ یہ ادیشن خاص اہتمام اور صحت کے ساتھ طبع کیا گیا ہے۔ شروع میں مولوی عبدالحق صاحب مدظلہ کا مقدمہ بھی ہے جو پہلے ادیشن میں نہ تھا اور آخر میں ایک اشاریہ (انڈکس) ہے جو ہر طرح سہولت بخش ہے۔

(ج)

## دیوان تاباں

مطبوعہ و شایع کردہ انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن۔ کاغذ، طباعت وغیرہ عمدہ۔ صفحات ۲۸۰۔ قیمت مجلد ۲ روپے چار آنے غیر مجلد ایک روپیہ ۱۲ آنے۔

مہر عبدالحق تاباں دہلوی محمد شاہی عہد کے شاعر ہیں۔ یہ وہ زمانہ ہے جس میں ایہام گوی کا زور تھا، لیکن اس کے آخر زمانہ میں ایہام گوی کے خلاف بعض شاعروں نے تحریک شروع کر دی تھی اور شاعری میں سادگی اور اس کی زبان میں اعتدال و توازن پیدا کیا جا رہا تھا۔ تاباں کا کلام اس دور اصلاح کی پیداوار ہے۔ تاباں کا انتقال ۱۱۶۱ھ اور ۱۱۶۵ھ کے درمیان ہوا ہے گویا محمد شاہی عہد کے اثرات ابھی پورے طور پر زایل نہیں ہوئے تھے۔ یہ پورا دیوان اسی عہد کے اخیر حصے میں تصنیف

ہوا ہے، اس لحاظ سے اس کی زبان کی صفائی، سادگی اور سلاست لایق داد ہے۔ تاہاں کے کلام میں تخیل کی بلند پروازی نہیں ہے۔ اس کی شاعری عام عاشقانہ مضامین اور بقول مہر ”گل و بلبل“ کی داستان تک محدود ہے۔ لیکن زبان و بیان کی خوبی اور لطافت کے اعتبار سے دلچسپ اور پڑھنے کے قابل ہے۔ مہر نے اپنے زمانے کی شاعرانہ زبان کا لحاظ کرتے ہوئے اس کے متعلق بہت صحیح رائے دی ہے۔

”زبان رنگینش پاکیزہ تر از برگ گل، گلستان سخن را نازک  
دماغ بلبل، سمد رنگینی، فکرش با گلگون باد بہار طابق  
الدعل بالدعل است۔ ہر چند عرصہ سخن او در لفظ ہائے گل  
و بلبل تمام است، اما بسواہ برنگین می گمت“

(پج)

## حامد کے سو شعر

حامد علی خاں بی۔ اے۔ - جائنت آڈیٹر رسالہ ہمایوں زیادہ تعارف کے محتاج نہیں۔ ان کا کلام اور ان کے مضامین ہمایوں اور دوسرے رسائل و جرائد میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ ان کے سو شعر کا انتخاب ادبی دنیا کے مدیر منصور احمد صاحب نے کیا ہے اور شروع میں دس صفحات کا دیباچہ لکھا ہے جس میں شاعر کی خصوصیات شاعری سے بحث کی ہے۔ انتخاب اچھا ہے اور پڑھنے کے قابل ہے۔ کتابت عمدہ، طباعت رنگین ہے اور کاغذ بھی اچھا ہے، تقطیع بھی عام سو شعری انتخاب سے کسی قدر بڑی ہے۔ قیمت چھ آنے۔ ملنے کا پتا: - دفتر ہمایوں، ۲۲ - لارنس روڈ - لاہور۔

(پج)

## حضرت احمق کے سواسو شعر

مرتبہ! مرزا ابراہیم بیگ صاحب ادیقر سرگزشت علی گڑہ

کچھ دنوں سو شعری انتخابات کی گرم بازاری رہی۔ اب سواسو کا آغاز ہو گیا ہے، مشہور کہاوت ہے سیر کو سواسیر۔ انتخاب کی یہ جدت مرتب نے شاعر کے تخلص اور اس کے رنگ شاعری کے اعتبار سے بہت خوب کی ہے۔ اکبر کے بعد ظرافت نگاری میں کئی شاعروں نے زور مارا لیکن اس کو اب تک کوئی نہیں پہنچا۔ حضرت احمق بھی ان ظرافت نگار شاعروں میں ہیں جو اکبر کے رنگ میں کہتے ہیں۔ ان کا کلام اکثر رسائل و اخبارات میں شایع ہوتا رہا ہے اس لیے وہ کسی تعارت یا تقریب کے محتاج نہیں ہیں۔ اس مجموعہ میں وہ اشعار نہیں ہیں جن میں سیاسیات پر سختی سے حملے کیے گئے ہیں۔ مرتب نے شروع میں ایک مختصر دیباچہ لکھا ہے جس میں حضرت احمق کے حالات اور ”احمقیات“ کا ذکر ہے۔

(پج)

### (۱) صہبائے ولا - (۲) جوش ولا -

مصنفہ شاہ ابوالحسن محمد مظفر حیدری - چھوٹی تقطیع،

صفحات و قیمت علی الترتیب ۱۱، ۲۸ - دیوڑہ آنہ، تین آنے۔

مصلف کے پتے، سی - اے - وی - ہائی سکول الہ آباد سے مل سکتی ہے۔

صہبائے ولا میں وہ چند نظمیں ہیں جو نعمت وغیرہ میں مصلف نے انٹالے

سفر حج میں لکھی ہیں۔ جوش ولا دراصل ایک نعتیہ نظم ہے جو عید

میلاد النبوی کی ایک محفل میں پڑھی گئی تھی۔ مصلف کو نعمت گوئی

میں اچھا خاصا ملکہ ہے۔ جو لوگ نعتیہ کلام سے ذوق رکھتے ہیں۔ ان کے لیے یہ دو کتابچے خالی از دلچسپی نہ ہوں گے۔

(ج)

## اتاقیق الصبیان

مصنفہ ڈاکٹر احمد شاہ صاحب۔ صفحات ۱۷۳۔ قیمت ایک

روپیہ چہ آنے علاوہ معصوم ڈاک۔ مصنف کے پتے، نور

منزل، ڈاک خانہ راج پور، دہرہ دروں سے مل سکتی ہے۔

یہ نظموں کا مجموعہ ہے جس کے متعلق مصنف نے لکھا ہے کہ ”۳۲ سالہ خدمت سے سبک دوش ہونے کے بعد ہمالہ کے پہاڑوں میں آخری دن بسر کرنے کا ارادہ کیا اور قریب ساڑھے چار سال سے یہاں مقیم ہوں۔ کچھ عرصہ یہاں رہنے کے بعد اکثر خیال ہوا کہ وقت گزارنے کے لیے کوئی دلچسپ مشغلہ ضرور ہونا چاہیے اور مشغلہ ایسا ہو جو دلچسپ تو ضرور ہو مگر کچھ مفید بھی ثابت ہو“۔ چنانچہ یہ مجموعہ اس دلچسپ مشغلے کی پیداوار ہے۔ جس کے لکھنے کا مدعا یہ ہے کہ بچوں کو ہندوستان کی مختلف چیزوں سے باخبر کیا جائے۔ اس میں تقریباً سوا پانسو نظمیں ہیں جن کو پانچ مختلف عنوانات کے تحت درج کیا گیا ہے۔ (۱) حیوانات، اس میں ۷۵ جانوروں کا ذکر ہے۔ (۲) مصنوعات، ان کی تعداد ایک سو ایک ہے۔ (۳) نباتات، ۱۷۶۔ (۴) پوشہ ور، ۱۶۳۔ (۵) متفرق، ۸۔

ہمارے ملک کے نہ صرف بچے بلکہ جوان اور بوڑھے تک مختلف جانوروں، پرندوں، پودوں اور پھولوں وغیرہ کے ناموں سے ناواقف ہوتے ہیں، اور ان کی خصوصیات اور خاص حالات سے بے خبر۔ ہماری

زبان میں کوئی ایسی جامع کتاب نہیں ہے جو خاص ہندوستانی چیزوں پر لکھی گئی ہو۔ ڈاکٹر احمد شاہ صاحب کو یہ خیال بہت خوب پیدا ہوا۔ لیکن انہوں نے جو راستہ اختیار کیا ہے وہ ہمارے خیال میں صحیح نہیں ایسی چیزوں کا بیان خواہ کتنی ہی دلائل اور دلچسپ نظم میں کیوں نہ ہو زیادہ مفید نہیں ہو سکتا۔ نظم کی پابندیاں وضاحت و تشریح چاہتی ہیں۔ ایسی حالت میں بچوں کے لیے اکثر ان چیزوں کو جو ان کی نظروں سے نہیں گزری ہیں نظم میں بیان کرنا ناقابل فہم نہیں تو سریع الفہم بھی نہیں۔ اگر اس میں تصاویر ہوتیں تو بھی آسانی ہوتی۔ موجودہ صورت میں اس سے صرف لفظی تعریفیں معلوم ہو سکتی ہیں، لیکن اشیا وغیرہ کی اصل حقیقت سے واقفیت پیدا نہیں ہو سکتی۔

(ج)

## مرقع سخن حصہ اول و دوم

مصنف ڈاکٹر مبارک حسین مبارک عظیم آبادی۔ صنعتکار و قیمت علی الترتیب ۸۳، ۲۰۰، آٹھ آنے، بارہ آنے۔ مصنف کے پتے، پتلہ سٹی ڈاک خانہ بیگم پور محلہ چوراہا آغا حسینا سے مل سکتی ہے۔

ان دونوں حصوں میں مصنف نے اپنی طبع زاد نظمیں جمع کی ہیں۔ پہلے حصے میں ۳۰ نظمیں ہیں اور دوسرے حصے میں ۸۸۔ ان کے موضوعات مختلف و متنوع ہیں، لیکن زیادہ تر صوبہ بہار سے متعلق ہیں، ان میں بھی بیشتر ایسی ہیں جو خاص خاص تقریبوں سے لکھی گئی ہیں۔ مثلاً کسی کے صاحبزادے کی تسمیہ خوانی، تعمیر مکان، کسی خاص فرض کے

لیے چلندہ، کسی کے اضافہ تنخواہ کی التجا، دوستوں یا ڈی اٹر لوگوں کی اونچے عہدوں پر ترقیاں، کسی طالب علم کا امتحان سے امتحان پاس کرنا، کسی مسجد کی ترمیم کے لیے عرض داشت اور چلندے کی اپیل، ٹی پارٹی، وداعی جلسہ، شادی اور دعوتوں کے رقعے، مبارکبادیں، تہنیتیں، کلب کے فوٹو وغیرہ وغیرہ --

مصنف کی فرض ان مجموعوں سے یہ ہے کہ طلباء کے نصاب میں شریک کیے جائیں، پہلے حصے کو وہ ہائی اسکول کی آٹھویں اور نویں جماعتوں کے لیے موزوں بتاتے ہیں، اور دوسرے حصے کو دسویں (میٹریکولیشن) کے لیے۔ مصنف ایک مشاق اور دیرینہ سال شاعر ہیں ان کا بیان ہے کہ ”راقم ۲۵ سال سے اردو کی بقا کے لیے اپنی ہستی کو فدا کر رہا ہے۔“

مجموں بنا ہوا ہے جو یہ سر سے پاؤں تک لیا کی شکل کھینچ رہا ہے قلم میرا“ اس دیرینہ تجربے کے مقابلے میں مجال لب کشائی نہیں، تاہم باادب یہ کہنے کی جسارت کی جاتی ہے کہ یہ مجموعے طلباء کی نصابی ضرورتوں کو شاید ہی پورا کریں۔ نظام کے موضوعات بہت وسیع ہیں جن سے طلباء کو اپنی تعلیم کی اہمائی منزل پر باخبر ہونا لازم ہے۔ اس نصابی مسئلے کا حل اب تک صرف یہی سمجھا جاتا ہے کہ مختلف اساتذہ کے کلام کا انتخاب کیا جائے اور اس طرح طلباء کو ہر استاد کے رنگ سے واقف کرایا جائے۔ اس سے طلباء میں بصورت پیدا ہوتی ہے اور وہ نظام کو سمجھنے اور اس کی اصلی روح سے آشنا ہونے کی صلاحیت پیدا کر لیتے ہیں۔ کسی ایک شاعر کا کلام پڑھانے سے یہ مقصد پورا نہیں ہو سکتا۔

## سلسلہ سبیل

مجموعہ کلام جناب آل احمد صدیقی سرور ایم - اے (ایگ)  
 سلسلہ مطبوعات انجمن اردو کے، مولیٰ نمبر ۱ کاغذ معمولی -  
 کتابت و طباعت اچھی - صفحات ۱۱۲ - قیمت ایک روپیہ -  
 ملنے کا پتا - درج نہیں -

کسی قوم کے انحطاط کا اندازہ لگانے کے لیے ایک یہی مشاہدہ کافی ہے کہ  
 اس کے افراد میں شعر خوانی اور شعر گوئی میں تمیز باقی نہیں رہتی یعنی ہر  
 شعر خوان شعر گوئی کی طرف مائل ہو جاتا ہے - یہ رجحان ایک خاص قسم کی ذہنیت  
 کا پتا دیتا ہے - جہاں ہمارے ماں میں ضبط اولاد اور ضبط نفس کی تحریکیں  
 شروع ہو چکی ہیں کاش شعر و ادب میں بھی کسی قسم کا ضابطہ نافذ ہو سکے  
 اور کم کردہ راہ شاعر نما حضرات اپنے اصلی دستوں کو پہچان جائیں -  
 'نژاد نو' کا ہر شاعر اپنا مجموعہ اس شان کے ساتھ مرتب کرتا ہے کہ  
 'ردق اللغی ہی اس کی تصویر پر نظر پڑے پھر ایک مرعوب کن مقدمہ اور  
 'ہدیہ محبت' ہو - چنانچہ یہ صفحات بھی ان صفات سے خالی نہیں  
 ہیں - بقول سرور صاحب ان کا "تخیل کشمیر کی بہاروں میں جوان  
 ہوا ہے" - لہذا یہ ہدیہ بھی انہیں بہاروں کے نام ہے - ان نظموں اور  
 غزلوں کو پڑھنے کے بعد ہمیں افسوس کے ساتھ کہنا پڑا 'اے واہ بہارے  
 اگر آپں مسمت بہارے!'، نظموں کے علاوہ جن میں سے بیشتر مناظر کشمیر  
 سے متاثر ہو کر لکھی گئیں مولانا محمد علی مرحوم کا ایک مرثیہ اور  
 کئی غزلیں بھی اس مجموعے میں شامل ہیں -

شروع میں رشید احمد صاحب صدیقی نے اپنے مخصوص انداز میں  
 ایک تعارف تحریر فرمایا ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ "سرور صاحب

اپنے کار ناموں کے اعتبار سے فسانہ عجائب سے کم نہیں ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ خواجہ حسن نظامی اور رشید احمد صاحب صدیقی اگر ایک دوسرے کو اپنی تحریریں دکھا لیا کریں تو وہ زیادہ دلچسپ اور شگفتہ ہو جائیں۔ خواجہ صاحب کا پیرایہ اتنا یک رنگ و ہموار ہے کہ اسے رشید صاحب کا پیچ و خم کسی نہ کسی قدر ملنا چاہیے۔ اور رشید صاحب کے تحریری بہول بہاواں میں خواجہ صاحب کی سادگی ایک نئی بات پیدا کر دے گی۔

مصورانہ شاعری کے بھی خارجی اور داخلی پہلو ہوتے ہیں۔ یا تو شاعر کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ الفاظ کی گل کاریوں سے چمن بڈی کر دے، پہاڑ کی بلندیوں کو آسمان سے ٹکرا دے، اور دریاؤں میں ایسے بہنور تال دے کہ ناظر سکتے میں آجائے اور سمجھ نہ سکے کہ یہ نظارہ خواب میں دیکھا تھا یا بیداری میں۔ یا پھر شاعر ان مناظر سے اثر پذیر ہو کر اپنے محسوسات کو یوں بیان کرے کہ سننے والے پر وہی کیفیت طاری ہو اور وہ ان تماشوں کو دیکھنے کے لیے بے تاب ہو جائے۔ جوش ملیح آبادی اور حنیظ جالذدھری کے کلام میں خارجی منظر کشی کے عمدہ نمونے ملیں گے۔ لیکن پیش نظر نظموں میں شاعر نے اپنے کو اُجاگر رکھنے کی اتنی کوشش کی ہے کہ تصویر کہیں نہیں رہی، صرف مصور رہ گیا اور اس کے جذبات میں وہی فرسودہ رومانی کیفیت ہے جو ہمارے اکثر رومانی نظم نگاروں کا طرہ امتیاز ہے۔ ان کی جوانی پیتھہ پر کتابوں کا پشتارہ لادے ہوئے عینک کے وسیلے سے حسن و عشق کی رنگیلیوں کا جائزہ لے رہی ہے۔ سرور صاحب اپنے ہم عصروں کی طرح اس جوانی کے احساسات کو خوبصورت الفاظ کے پردوں میں بھی چھپا نہ

سکے - اجنبی ترکہیں اور نامرزوں بددشیں جا بجا نظر آتی ہیں -  
 ”مرے دل میں بھی لہریں سی کئی بے ساختہ اُٹھیں“ - (صفحہ ۱۷)  
 لہروں کی بے ساختگی یعنی چہ؟

حباب احمریوں کی شوخیوں فرس زمرہ پر  
 مرا وہ راز جو یوں بر ملا افشا نظر آیا (صفحہ ۲۸)  
 دونوں ہی مصرعے زبان حال سے کہہ رہے ہیں کہ انہیں ایک دوسرے  
 سے دور کا بھی لگاؤ نہیں ہے -

عروس شعر نے پردہ اُٹھایا روے روشن سے  
 بڑھے اہل نظر ساغر بکف شاخ نشیمن سے (صفحہ ۳۱)  
 گویا شاخ نشیمن پر پلچھپوں کی طرح اہل نظر اس ٹاک میں  
 بیٹھے رہتے ہیں کہ شاعری کی دیوی بے نقاب ہو اور یہ اس کی طرف  
 پر پھیلا ئیں -

”یا میرے ذوق نظر کی آخری پرواز ہے“ - (صفحہ ۳۷) نظر کی  
 پرواز بھی ذوق نظر کی پرواز اور وہ بھی آخری پرواز! سسد ناز  
 پر یہ تازیانہ!

”مگر لبوں پہ یہی ایک دعا نظر آئے“ - (صفحہ ۳۹)

دعا نظر بھی آسکتی ہے یہ ہمیں آج معلوم ہوا -  
 نظموں میں صرف ایک پرواز خیال اچھی ہے اور اس میں بھی اس  
 اس قسم کے مصرعوں کی فراوانی ہے ”تمام دیدہ حیرت بنا ہوا ہوں میں -“  
 غزلوں پر اصغر گوندوی کا اثر صاف نمایاں ہے اور کہیں کہیں  
 جگر مراد آبادی کی پیروی کی کوشش بھی کی گئی ہے - ان دونوں کی  
 غزلوں پر طبع آزمائی بھی کی گئی ہے اور نتیجہ جس صورت میں

برآمد ہوا وہ ملاحظہ ہو :

”تارے‘ اجالتے‘ ہیں میری گردِ راہ کو“ (صفحہ ۸۲)

”وہ روشنی ہو رہی ہے دل میں کہ‘ محفل میں جگمگا رہا ہوں“ (صفحہ ۸۷)

”سرور بزم کو اتنا‘ چھکا‘ نہ دوں تو سہی‘ (صفحہ ۱۰۱)

”ہزاروں لولوے لالہ لیے بیٹھا‘ ہوں متغزل میں۔“ ”خرام موج سے

لولوے تہہ نشیں بہتر۔“

غرض غزلوں سے نظمیں پھر بھی غنیمت ہیں کہ ان گہڑ اور بے چور

ترکیبوں کے لیے ان میں کسی نہ کسی طرح گنجائش نکل ہی آتی ہے۔

غزلوں میں وہی چوچلے ملیں گے جنہیں رشید صاحب نے اپنے دیباچے

میں ”شورہ پشت“ شاعروں کے لیے مخصوص کیا ہے۔ ان کے عشق کی

داستان ان ابواب میں تقسیم کی جاسکتی ہے۔

پہلا سین: ”ہزاروں لولوے لالا لیے بیٹھا ہوں سیدوں میں“ (صفحہ ۸۱)

دوسرا سین: ”زیر وزبر ہے قافلہ صبر و قرار کا“ (صفحہ ۹۴)

تیسرا سین: ”پیشانیوں پہ نور حرم لے کے آئے ہیں“ (صفحہ ۳)

چوتھا سین: ”اور بڑھتا جا رہا ہے بار سر کو کیا کروں“ (صفحہ ۱۰۹)

دراپ سین: ”حضور حسن میں دل باریاب ہو نہ سکا“ (صفحہ ۸۷)

یہ مختصر سی رویداں ہے ہساری ’شورہ پشت شاعری‘ کی، جس

کا نمونہ یہ مجموعہ ہے۔

(نا خدا)

## ذہستان

اثر صہبائی کے کلام کا مجموعہ

صفحات مع مقدمہ وغیرہ - تقریباً ۳۰۰ - کاغذ کتابت و طاباعت اچھی -

قیمت ۲ روپیہ ۸ آنہ ملنے کا پتا - آزاد بک ڈپو، سیالکوٹ، پنجاب -

جناب اثر صہبائی پنجاب کے مقبول اور ممتاز نوجوان شاعر ہیں۔  
خمسنتان ان کے کلام کا دوسرا مجموعہ ہے۔ اس میں غزلوں اور رباعیوں  
کے علاوہ نظمیں اور قطعات بھی ہیں۔

مجموعے کے آغاز میں ”دنیا ئے ادب کے سایہ ناز ادیب“ (بقول  
مصنف) سید ساجد صاحب ندوی نے جرعہٴ سنی کے عنوان سے ایک مقدمہ  
تحریر فرمایا ہے اور بلذت کیفی صاحب نے بھی اس سہنت کی پابندی  
کی ہے۔ سید صاحب نے اس مقدمے میں ایک بڑی دلچسپ بحث یہ کی  
ہے کہ اہل حدیث حضرات شاعر ہوتے ہیں یا نہیں۔

مجموعے کا پہلا باب ’تجلیات‘ غزلوں پر مشتمل ہے اور غالباً سب  
سے زیادہ طویل ہے۔ غزل گوئی کی صنف نہایت نازک اور مشکل ہے اور  
یوں صنفی اعتبار سے کوئی اس پر عبور حاصل بھی کر لے لیکن خود فراموشی  
کا وہ جذبہ کم کو میسر ہوتا ہے جو عشقیہ شاعری کی جان ہے اور جس  
کے بغیر غزل بالکل روکھی پھیکھی رہ جاتی ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ اثر  
صاحب کی طبیعت حکمت اور فکر کی طرف زیادہ مائل ہے اور ان میں ایک  
خاص قسم کا ضبط ہے۔ اس لیے اسی صنف میں انہیں جولائی طبع کا زیادہ  
موقع ملے گا جو اس قسم کے رجحان کے لیے موزوں ہو۔ غزل جس قسم  
کی صناعی اور خود فراموشی کی طالب ہے وہ اثر صاحب کو ودیعت نہیں  
ہوئی۔ چنانچہ غزلوں میں فی الجملہ بہت کم ایسی ہیں اور ان میں بھی  
ایسے اشعار کم ہیں جو دل میں اتر جائیں۔ ایک طرف ایسی غزل موجود ہے :-

دنیا میں ہزاروں خوشیاں ہیں، یہ دنیا عشرت خانہ ہے

اس بزم میں لیکن مہرا بھی ایک درد بہرا افسانہ ہے

برگشتہ قسمت والوں کا نے کعبہ نے بیتخانہ ہے  
 ہاں دو ہی سہارے ہیں ان کے - یا موت ہے یا پیمانہ ہے  
 ہو شاخ جب ایک مستمانہ ہے ہر پھول جب ایک پیمانہ ہے  
 تو بہ! ایسے میں تو بہ؟ جب فطرت خود میخانہ ہے  
 کچھ فرق نہیں ہم مستوں کے کاشانے اردر میخانے میں  
 کاشانہ ہی میخانہ ہے میخانہ ہی کاشانہ ہے

اثر صاحب کی بہترین غزلوں میں سے یہ ایک ہے پھر بھی مقدمہ  
 نثار کو بصد تکلف اس کے ہر شعر پر اصلاح دینے کی ضرورت محسوس  
 ہوئی - کہیں کہیں ”بخت واڑوں“ (صفحہ ۱۴) جیسی عجیب ترکیبیں  
 ملیں گی جو الفاظ کے ترنم کے ساتھ بگل کی آواز کا کام کرتی ہیں -  
 اس میں شک نہیں کہ بسا اوقات ایسے شعر بھی نکل آتے ہیں کہ سخن  
 شناس سوچتے رہ جائیں کہ شاعر کیا کہہ گیا :

جستجوے منزل میں بے قرار و آوارہ

میں بھی ایک منظر ہوں موجہاے دریا کا

دھرو محبت کے ہر قدم پہ منزل تھی

حسن کا تھا آئینہ ذرہ ذرہ صحرا کا

زندگی سرزھے کہ تادم زیست ختم پر آہ آنشیں نہ ہوئی

آستانے نگاہ سے گزرے مایل بندگی جبین نہ ہوئی

کچھ شغل زندگی کے لیے بھی تو چاہیے

تقدیر سے اگر نہ لڑے کیا کرے کوئی

لیکن ایسے اشعار خال خال ہی ہیں -

دوسرا باب بعدواں ’سمن زار‘ نظموں پر مشتمل ہے اور یہاں شاعر

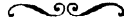
کو اپنے اس نظریہٴ شباب کے پھیلا نے کا خوب موقع ملا ہے جس کی تشریح وہ پہلے کر چکا ہے :-

کیف آفریں ہے یاد جوانی رسوائی و رندی و بت پرستی  
چنانچہ یہاں شیب و شباب کی رنگینیاں ابلی پرتی ہیں - غزلوں  
سے کہیں اچھی ہیں ، خصوصاً بہاریہ اور ' محبت اور موت ' خوب ہیں -  
' جام صہبائی ' رباعیات کے لیے وقف ہے اور یہ اثر صاحب کا خاص  
مہدان ہے - شاہد یہ مبالغہ نہیں کہ جگت مومن لال روں آن جہانی کے  
بعد امجد حیدر آبادی اور اثر صہبائی اس اقلیم سخن کے آہا و دل ہیں -  
ہماری شاعری کی بدنصیبی ہے کہ اس کا رکن اول نوحہ خوانی قرار  
پا گیا ہے اور ولی دکنی سے لے کر دور حاضر تک کے جس شاعر کو دیکھیے  
چرخ کج رفتار کو بد دعائیں دیتا اور دامن و گریباں کے درپے ہو کر اپنے  
انلاس میں زیادتی کرنے پر تلا رہتا ہے - وجہ یہ ہے کہ ہماری سوسائٹی  
میں انسان کی تمنائیں قدم قدم پر پامال ہوتی ہیں اور ان کی تکمیل  
کا موقع بہت کم ملتا ہے - خصوصاً اب حالات ایسے ہو گئے ہیں کہ ہمارے  
نوجوان زیادہ حساس ہوتے جاتے ہیں کیونکہ ان کے ارادوں کی تکمیل  
کے تمام راستے بند ہیں اور اس کا رد عمل لامحالہ حزنیت کی صورت  
میں ہوگا - اثر صاحب جس اندوہ و ملال کی تاجھت پوی رہے ہیں وہ فطری  
نہیں بلکہ ماحولی ہے - امید ہے کہ وہ بہت جلد اس مہلک مرض کو  
اپنے دامن سے جھٹک دیں گے اور اس کا آئندہ مجموعہ نوحہ فم نہیں بلکہ  
پیام عمل ہوگا -

کچھ رباعیات درج کی جاتی ہیں جو اثر صاحب کے مخصوص رنگ

میں ہیں اور حق یہ ہے کہ خوب ہیں -

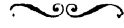
صحراے جہاں میں ایک فریاد ہوں میں      ظلماتِ فلک میں برق آباد ہوں میں  
جو پائے سکون جاوداں ہوں یعنی      ناشاد ہوں بیتاب ہوں برباد ہوں میں



جو لطاف ہے جستجو میں حاصل میں نہیں      لذت جو تگ و دو میں ہے منزل میں نہیں  
وہ منظرِ زندگی کہ امواج میں ہے      کشتی میں نہیں، سکوت ساحل میں نہیں



تاراج خزاں ہوں اردو قصاں ہوں میں      گلہائے بہار میں پریشاں ہوں میں  
لذات و علم بھی ایک معمہ ہیں اثر      خوش رنج میں اور خوشی میں گریاں ہوں میں



ہو جائے عیاں جو مجھ پہ ہستی میری      پھر کوئی سنے صدائے مستی میری  
معبود ہوں آپ ہی عبادت کس کی؟      ہے بے خبری خدا پرستی میری  
خوب کہا —

بہ این ہمہ، شاعر کہیں کہیں جذبات کے تلاطم میں بہہ جاتا اور  
ایسی باتیں کہہ جاتا ہے کہ مقدمہ نگاروں کے 'مشوروں' کے باوجود وہ  
کانوں کو کھٹکتی ہیں۔ رہا مہیات میں فرط بے نیازی سے کبھی کبھی مصرعوں  
میں ایسی تکرار ہونے لگتی ہے جو ناگوار معلوم ہوتی ہے :

"کیوں شکوہ روز گارے دل اے دل

دنہا تھری ہے میں بھی تیرا، تیرا

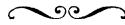
مرنا تو میں جانتا ہوں - ہوگا ہوگا"

'راحت کدے' میں شاعر نے اپنی رفیقہ حیات کی یاد میں جو قطععات  
کہے ہیں ان میں سے کئی بہت پر درد ہیں اور بتلاتے ہیں کہ خلوص  
جذبات صحیح صناعت کی سب سے بڑی ضمانت ہے :

سحیر کے روے رنگیں سے نقاب القاءے جاتے ہیں  
 دل معزوں پہ لیکن غم کے بادل چھائے جاتے ہیں  
 تمہارے ہجر میں باد صبا ایک آہ غم گیس ہے  
 نہیں تم جلوہ گر تو پھول بھی مرجھائے جاتے ہیں  
 تمہارے غم رہا جلدے عیاں ہیں لالہ زاروں میں  
 تمہارے دل نشیں نغمے رواں ہیں آبشاروں میں  
 تمہارا روے رنگیں ماہ تباں میں درخشاں ہے  
 تمہاری مسکراہت رقص کرتی ہے ستاروں میں

اثر صاحب قدرت کی طرف سے شاعرانہ دل و دماغ لے کر آئے ہیں  
 اور ان کا مستقبل روشن ہے۔ مشق کے ساتھ پختگی آتی جائے گی اور اگر  
 ان کے مشاہدے کا دائرہ وسیع ہوگا اور وہ عوام کے دکھ اور اس کے مداوے  
 کو سمجھ سکے تو ان کے کلام میں وہ شگفتگی ضرور آجائے گی جس کی توقع  
 ایک شباب پرور شاعر سے کی جاتی ہے۔

( نا خدا )



## (۱) سویشی اردو (۲) ضروری کہانیاں -

( مصنفہ قاضی عبدالصمد صاحب - کاغذ طباعت و کتابت ، قاہمیت -

پہلی میں ۳۰ صفحات ہیں اور قیمت چار آنے ہے - دوسری میں

۷۲ صفحات ہیں اور قیمت چھ آنے ہے - ملنے کا پتا - مولوی محمد

ادریس مہر تھی - مکتبہ شرقیہ - دہلی )

دونوں کتابیں اسکول کی ضروریات کو مدنظر رکھ کر لکھی گئی

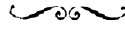
ہیں اور اس لائق ہیں کہ ہمارے طلبہ انہیں بار بار پڑھیں —

سودیشی اردو سیدانشا کی 'رانی کیٹکی کی کہانی' اور ہندی کے مشہور شاعر ہری اودہ کی 'تہتہ ہندی کے تہات' کے طرز کی کتاب ہے۔ خوبی یہ ہے کہ فارسی اور عربی کا ایک لفظ نہ ہوتے ہوئے بھی زبان پاکیزہ اور فصیح ہے۔ اگر اس قسم کی کتابیں برابر اشاعت پذیر ہوا کریں تو اس تحریک کو بڑی تقویت ہوگی جو مرلویانہ اردو اور پنڈت تانہ ہندی کی دیکھ بول چال کی زبان کو ملک کی مشترکہ قومی زبان بنا نا چاہتی ہے۔ دوسری کتاب بھی بہت مفید ہے اور اسکی تالیف کا مقصد نہایت مستحسن ہے۔ یہ ہندوستان کے ایسے تاریخی واقعات کا مجموعہ ہے جن سے (۱) اہل ملک میں باہمی محبت اور حب وطن کے جذبات پیدا ہوں۔ (۲) جن سے اچھا اخلاقی سبق حاصل ہو۔ (۳) جن حکمرانوں کے متعلق بعض اشتعال انگیز واقعات مشہور ہیں ان کے وہ واقعات لکھے جائیں جن سے بدگمانیاں رفع ہوں —

یہ امر کتنا افسوس ناک اور باہمت شرم ہے کہ ہمارے ملک میں جہاں آئے دن ایسی تحریکیں اٹھا کرتی ہیں جن سے فرقہ وارانہ کشیدگی پڑھتی جائے اور ایسی تحریریں بکثرت شایع ہوتی ہیں جن میں سے دلوں کی سیاہی کاغذ پر اندلیلی جاتی اور باہمی مناقشت کی آگ کو ہوا دی جاتی ہے، وہاں اتحاد و رواداری کا چہنڈا برابر خاک بسر ہے اور کم لوگ ایسے ملتے ہیں جو اس خلیج کو پاتلے کی کوشش کریں۔ اس قحط الہال میں ایسی کوششیں لائق ستائش ہیں —

کیا اچھا ہو کہ ہماری قوم کے نو نہال ان افترا پرداز تاریخوں کو پڑھنے پر مجبور نہ کیے جائیں جو اوائل عمو سے ان کے دلوں میں کیلہ و تعصب کے

جذبات پیدا کرتی ہیں - اور اس قسم کی کتابیں ان کے ہاتھ میں ہوں جو  
یک جہتی اور قومیت کی روح پہونکیں !  
” نا خدا “



## منتخب افسانے

مترجمہ ملیح آبادی صاحب - حجم ۵۰ صفحات - کاغذ کتابت و  
طباعت معمولی - قیمت ایک روپیہ - ملنے کا پتا  
ہلد بک ایجنسی چت رنجن اونیو کولکتہ

مترجم نے مشرق و مغرب کے شہرہ آفاق افسانہ نگاروں کے ۳۸ افسانوں کو  
اردو میں منتقل کیا ہے - افسانہ نگاروں یا افسانوں کے انتخاب میں کوئی  
خاص التزام ملحوظ نہیں ہے - ترجمے کے متعلق یہ طریقہ اختیار کیا گیا  
ہے کہ ” افسانہ نگار کی اسپرٹ کو سمجھ کر اسے اردو کے قالب میں ڈھال  
دیا ہے “ - ہمارے خیال میں یہ طریقہ کسی طرح مستحسن نہیں ہے -  
جب تک آرٹسٹ کی لغوی اور معنوی خوبیاں برقرار نہ رہیں اس  
کے کمال کا صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا - افسانہ ایک unit ہے جس کی  
اسپرٹ اگر روح ہے تو پیرایہ بیان جسم ہے - ’قالب میں ڈھالنے‘ والی  
ترکیب سے قصہ ہی قصہ باقی رہ جاتا ہے اور لطف بیان کی تمام نزاکتیں  
ضایع ہو جاتی ہیں - ان میں سے کئی افسانے انگریزی میں ہماری نظر  
سے گزر چکے ہیں اور ہمیں یہ کہنے میں تامل ہے کہ ترجمہ میں اصل کے  
حسن کی ایک جھلک بھی موجود ہے شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ اکثر تراجم  
عربی سے چھن کر اردو میں پہنچے ہیں اور اس صورت میں نگارش کی  
دلکشی کا باقی رہنا محال ہے - ترجمے کی عبارت یک رنگ ہوتے ہوئے بھی  
صاف اور سلیس ہے - ایک دو قصوں کے ساتھ مصنف کا نام نہیں ہے مثلاً

شیخ حسن علی تھانہ دار - ممکن ہے یہ مترجم کی جدت طبع کے نمونے ہوں -  
 ملیح آبادی سے غالباً عبدالرزاق صاحب ملیح آبادی کی طرف  
 اشارہ ہے جو عربی کی کئی کتابوں کے ترجمے کر چکے ہیں - ملیح آبادی میں  
 اردو کے اور بھی ادیب ہیں اس لیے پورا نام نہ ہونے سے شبہ کی  
 گنجائش رہ جاتی ہے -

بہر حال، جو لوگ انگریزی نہیں جانتے انہیں اس کتاب میں  
 یورپ کے کامیون فن کا ایک ہلکا سا عکس مل سکتا ہے - ان دامنوں کتاب مہنگی  
 بھی نہیں ہے - ”ناخدا“



## لال قاعہ کی ایک جھلک

مصنفہ - خواجہ ناصر نذیر فراق مرحوم دہلوی - کتابت و  
 طباعت دیدہ زیب - حجم ۱۲۵ صفحات - قیمت ایک روپیہ -  
 مالے کا پتلا - ساقی بک ڈپو، کھاری باؤلی دہلی -

فراق مرحوم دہلی کی اس تہذیب و معاشرت کے اٹینہ دار تھے جس کے  
 خط و خال انقلاب زمانہ نے بالکل مسخ کر دیے اور اب وہ باتوں خواب معلوم ہوتی  
 ہیں۔ ان کے بعد اب کوئی نہیں رہا جو اس خراب آباد کی یاد تازہ کرے -  
 دلی کی زبان لکھنے میں فراق مرحوم کو ید طولی حاصل تھا اور یہ کتاب  
 ان کے مخصوص طرز انشاء کا بہترین نمونہ ہے - دلی یہ کتاب شرر کے شاہ کار  
 ”گزشتہ لکھنو“ کے جواب میں پیش کر سکتی ہے - شاہد احمد صاحب مدیر  
 ساقی مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے بڑی کاوش سے یہ مضامین  
 لکھوائے اور مرتب کر کے کتابی صورت میں شائع کیے ورنہ یہ انمول موتی

یونہی بکھرے رہ جاتے۔ قدیم تمدن اور لطف زبان سے شغف رکھنے والوں کے لیے اس کا مطالعہ باعث مسرت ہوگا۔  
”ناخدا“

## تاریخ و سیر

### حیات مسعودی

(نوشتہ مولوی محمد عباس خان صاحب شروانی - صفحات

۱۶۱ قیمت ایک روپیہ چار آنے)

سالار مسعود غازی ( عرف بالے میاں ) کا نام جس قدر مشہور اور زبان زد خلایق ہے اسی قدر ان کے اصل حالات و واقعات تاریکی میں ہیں۔ مولوی محمد عباس خان صاحب شروانی نے جہاں تک ان کی دسترس تھی مختلف تاریخوں، کتبوں، زبانی روایتوں وغیرہ سے تحقیق کر کے ان کی تاریخ مرتب کی ہے۔ مسعود غازی کے حالات میں صرف ایک ہی کتاب مرآة مسعودی ہے، جس میں بہت کچھ مبالغہ ہے اور بہت سی ایسی باتیں درج ہیں جو ساقط الاعتبار ہیں۔ اگرچہ مولف کتاب ہڈانے اپنی تاریخ کی بہت کچھ بنیاد اسی پر رکھی ہے لیکن انہوں نے تحقیق و تلاش میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ ان تمام قدیم و جدید تاریخوں کا مطالعہ کیا ہے جن میں مسعود غازی کا ذرا سا بھی حوالہ تھا۔ بعض کتابیں جو دستیاب نہیں ہوئیں اور جن کا نام صرف دوسری تاریخوں میں ضماً

آگیا ہے، اس میں مجبوری تھی۔ موجودہ حالات میں قابل مولف کی سعی و محنت لائق تحسین ہے۔

## نئی کواٹھ محسن

(مولفہ مولوی محمد امین صاحب زبیری - صفحات ۳۰۸ + ۲۵)  
قیمت غیر مجلد ایک روپیہ چار آنے، مجلد ایک روپیہ آٹھ آنے)۔

اس کتاب میں نواب محسن الملک سوڈ مہدی علی مرحوم کے حالات زندگی بیان کیے گئے ہیں۔ لکھنے والے مولوی محمد امین صاحب ہیں جن کو کچھ دنوں نواب صاحب مرحوم کے ساتھ رہنے کی عزت حاصل رہی ہے۔ اگرچہ محمد امین صاحب کے تعلق کا سلسلہ اس وقت سے شروع ہوا جب کہ نواب صاحب حیدرآباد سے رخصت ہو کر بمبئی میں قیام فرما تھے۔ لیکن چونکہ خود محمد امین صاحب کو زمانہ دراز تک ایک اسلامی ریاست سے تعلق رہا اس لیے وہ ریاستوں کے معاملات کو خوب سمجھتے ہیں اور انہیں حیدرآباد کے حالات و معاملات کے سمجھنے میں ذرہ بھی دقت نہیں۔ حیدرآباد کے بعد علی گڑھ کالج کا دور شروع ہوتا ہے اور یہیں ان کی زندگی کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ کالج کے حالات بھی لائق مولف نے بہت تحقیق سے جمع کیے ہیں یہ گویا اس وقت کے کالج کی صحیح تاریخ ہے۔

اس سے قبل محمد امین صاحب نے آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرس کے لیے بھی نواب محسن الملک کی سوانح عمری لکھی تھی۔ لیکن اب کے انہیں اتفاق سے اور کچھ نواب مسعود جنگ بہادر کی سعی سے نیا مسالا

ہاتھ لگا ہے جس سے یہ سیرت مکمل ہو گئی ہے۔ آخر تمہیں بعض ضمیمے بھی اضافہ کیے گئے ہیں اور بعض انگریزی تحریریں اور خطوط جو اعلیٰ درجے کے انگریزوں نے خاص معاملات پر نواب صاحب کو لکھے تھے بجزسہ چھاپ دیے ہیں۔ ان میں لارڈ ڈفرن کا خط پڑھنے کے قابل ہے۔

نواب صاحب میں بعض ظاہری اور باطنی ایسی خوبیاں تھیں جو اب شاذ و نادر پائی جاتی ہیں۔ چونکہ وہ مختلف حیثیتوں کے جامع تھے۔ ان کا تعلق ملک اور خصوصاً مسلمانوں کی زندگی اور بہبودی سے تھا اس لیے ان کی زندگی بہت ہی دلچسپ اور بصیرت افروز ہے۔ مولوی محمد امین صاحب نے اپنے اس فرض کو بڑی خوبی اور محنت سے انجام دیا ہے۔



## انقلاب فرانس

مصلفہ باری صاحب - صفحات ۱۰۷ - قیمت درج نہیں - کتابت و

طباعت اچھی - ملنے کا پتہ - اردو بک اسٹال لوهاری گھٹ - لاہور -

انقلاب فرانس تاریخ عالم کا نہایت اہم واقعہ ہے اور سنہ ۱۷۸۹ ع

عصر جدید کی آفرینش کی تاریخ کہی جاسکتی ہے - آج دنیا میں مساوات

اخوت اور آزادی کے جو پرچم لہرا رہے ہیں اس کی ابتدا اول اول وہیں

سے ہوئی - زیر نظر کتاب میں مصلف نے پہلے تو نشاۃ ثانیہ سے لے کر لوئی

پانزدہم کے عہد حکومت تک کا ایک سرسری سا جائزہ لیا ہے - بعد از آن

استبداد کا خاکہ پیش کر کے امکانات انقلاب پر بحث کی ہے - اس ضمن میں

انہوں نے جو کچھ لکھا ہوگا صحیح ہو یا غلط لیکن ہم ان کی انقلاب کی

تعریف کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں کیونکہ وہ بادی النظر میں انقلاب

اور بغاوت میں کوئی امتیاز نہیں سمجھتے درآن حالیکہ ان دونوں میں بعد مشرقین ہے۔ کروپائکن اپنی تاریخ انقلاب فرانس میں اس تاریخی روش (Process) کی یوں تشریح کرتا ہے: شہروں اور دیہاتوں کی بہتیری بغاوتوں سے بھی انقلاب کا دائرہ کہیں زیادہ وسیع ہے۔ وہ خوفناک سے خوفناک جماعتی لڑائیوں یا حکومت کی تبدیلیوں سے زیادہ دور رس ہے۔ انقلاب نام ہے چشمِ زدن میں ان اداروں کے نیست و نابود ہو جانے کا جو صدیوں سے قائم تھے اور جن کی بنیادوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بڑے بڑے سورما رفاد مر بھی لڑتے تھے۔ انقلاب نام ہے اس عہد کے سیاسی، اقتصادی اور سماجی ایوانوں کے زمین دوز ہو جانے کا۔ انقلاب تعلقات انسانی اور سماجی اداروں کی قدیم بنیادوں کو تھس تھس کر کے نظامِ زندگی کا ایک نیا ڈھانچا کھڑا کرتا ہے۔ پھر اس کے اصول رفتہ رفتہ دنیا میں پھیلتے جاتے اور آنے والی نسلوں کے لیے تمدنی، اقتصادی اور سیاسی ترقی کی نئی شاہراہیں کھول دیتے ہیں۔ اس لحاظ سے انقلاب فرانس کی نوعیت بالکل مختلف ہے۔۔۔

مصنف یہ بتلانے میں کامیاب ہوئے ہیں کہ انقلاب کی تحریک کس ماحول میں نشوونما پا رہی تھی۔ لیکن انقلاب کی قیادت کن ہاتھوں میں تھی اس کے سپاہی کون تھے، اس کے مطالبات کیا تھے، اور وہ کیوں نہ پورے ہوئے۔ ان اہم سوالات کا جواب اس کتاب میں ملے گا۔

یہ فرانس کا سرمایہ دارانہ جمہوری انقلاب - (Bourgeois democratic Revolution) تھا۔ یعنی یہ سامنتی شکنجوں سے آزاد ہونے کے لیے حرفتی سرمایہ داری کی کامیاب سعی تھی۔ ہر حکومت کا دارومدار کسی خاص طبقے کے اقتصادی مفاد پر ہوتا ہے اور اس کے استوار ہونے کی ضمانت اس طبقے کے فروغ پر ہے۔ جب کوئی نیا طبقہ اپنے تاریخی فرایض کو پورا کرنا

چاہتا ہے تو ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ حکومت وقت کو ایسی تشکیل دے کہ وہ اس کے ارادوں میں ہارچ نہ ہو۔ فرانس میں مشینوں کے رواج اور دور حرفت کے آغاز کے بعد یہ ناگزیر تھا کہ فرسودہ نظام حکومت بدل جائے تاکہ اس کی پیش پا افتادہ پابندیاں متوسط طبقے کی راہ میں حایل نہ ہوں۔ اس مہم میں وہ صرف اس وقت فکریا ہوتا ہے جب کہ عوام اس کے دوش بدوش استبداد سے لڑیں۔ جب ان کی امداد سے متوسط طبقے نے سادہت سے نجات حاصل کی تو مساوات، اخوت اور آزادی کے معنی بدل گئے۔ پھر سرمایہ داروں میں ان ارکان ثلاثہ کے مطلب یہ سمجھے جانے لگے کہ آزادی ہو مگر ظلم کرنے کی۔ اخوت ہو لیکن صرف ظالموں میں۔ اور مساوات ضرور ہو لیکن عالم بالا میں۔ لیکن یہ بھی ایک ناگزیر نشان راہ تھا کیونکہ اس زمانے میں وہ شتراکی انقلاب ممکن ہی نہ تھا جس کے سرگرم موئید باری صاحب معلوم ہوتے ہیں۔ مارکس اور لینن نے اپنی کتابوں میں جابجا اور خصوصاً ”پیرس کمیون“ میں اس کا اعتراف کیا ہے۔

بہر حال یہ مسئلہ ایک بسیط مقالہ کا حاجت مند ہے اور ہم صرف یہ کہہ کر اکتفا کرتے ہیں کہ اس کتاب کے حدود کو دیکھتے ہوئے اس میں معلومات کا نہیں تو دلچسپی کا کافی مواد موجود ہے۔ طرز تحریر خطیبانہ ہوتے ہوئے بھی دلکش ہے۔ کتابیات میں حسب ذیل کتابوں کا اندراج ضروری تھا۔

(۱) انقلاب فرانس از ہالینڈ روز (۲) انقلاب فرانس از میدلن (۳) انقلاب فرانس از مالیت (۴) انقلاب فرانس از کروپاٹکن (۵) انقلاب فرانس میشلے (۶) انقلاب فرانس از اولارد (۷) انقلاب فرانس از کارلائیل —

## متفرقات

### اردو پوائٹری میں ارس صوبہٴ متوسط و برار کا درسی سلسلہ

(عطر چند کپور ایڈٹ سنزبک سلہرز ایڈٹ پبلشرز لاہور)

اس سلسلے میں اردو کا قاعدہ اور پہلی چار کتابیں شامل ہیں۔ یہ سب کتابیں عمدہ کاغذ پر بہت اچھی چھپی ہیں۔ قاعدے میں ابھی اصلاح کنی بہت کچھ گنجائش ہے۔ موجودہ صورت میں بچوں کے لیے کوئی سہولت نہیں پائی جاتی۔ اعراب کے لگانے میں بھی کوئی خاص اصول مد نظر نہیں رکھا گیا۔ باقی چار کتابیں تعلیمی اور ادبی لحاظ سے بہت مناسب اور معقول ہیں۔ زبان ایسی رکھی گئی ہے جو اس صوبے کے بچوں کے لیے غیر مانوس نہیں۔ بعض اسباق ایسے داخل کیے گئے ہیں جن کا تعلق خاص صوبہٴ برار سے ہے اور یہ اس سلسلے کے لیے ضروری تھا۔ علاوہ ادبی اور اخلاقی مضامین کے عام معلومات کے مضامین بھی کافی تعداد میں ہیں۔ موقع سے عکسی اور رنگین تصویریں بھی دی گئی ہیں۔ خاں صاحب خواجہ لطیف احمد صاحب بی۔ اے نے جن کی تمام عمر تعلیم و تعلم میں گزری ہے، اس سلسلے کو مرتب کیا ہے۔ اس کی ترتیب و تالیف میں خواجہ صاحب نے بڑے سلیقے سے کام لیا ہے۔

# اُردو کے جدید رسالے

## انیس

(ادیٹر شرار بی - اے صاحب - سالانہ قیمت - دو روپے آٹھ آنے -

ایلچ پور ، برار)

یہ ماہانہ رسالہ ایلچ پور برار سے شایع ہوتا ہے - مضامین مختلف قسم کے اور دلچسپ ہوتے ہیں - اس علاقے میں ایک ایسے رسالے کی بہت ضرورت تھی - اہل برار کو اس اردو رسالے کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے ، وہاں ابھی اردو کا چرچا ہے اور اس کی ترقی اور اشاعت کے لیے ہر طرح کی سعی درکار ہے ۔

## صبح امید

(ادیٹر مدن کوپال مثل صاحب بی - اے - سالانہ قیمت

تین روپے - مقام لدھیانہ)

یہ ماہانہ رسالہ جو ابھی لدھیانہ سے نکلتا شروع ہوا ہے ، ہونہار معلوم ہوتا ہے - سرورق پر ”علمی ادبی اور تعلیمی“ رسالہ لکھا ہے اور اس مقصد کے نبھانے کے لیے قابل ادیٹر نے مفید اور دلچسپ دونوں قسم کے مضامین جمع کیے ہیں —

## اولاد علیگریں

(ایڈیٹر سعید محمد خان صاحب بھوپالی - کراؤن سائز اردو کے ۴ اور انگریزی

کے ۴ صفحات - کاغذ طباعت و کتابت اچھی - سالانہ قیمت - ۱۲ روپے)

سعید محمد خان صاحب پہلے بھی یہ اخبار نکالتے تھے اور اب علی گڑھ اور وہاں کی جمعیت کی خدمت کے ارادے سے از سر نو اس کی اشاعت شروع کی ہے۔ پیش نظر نمبر اس جریدہ کا (experimental) یعنی تجرباتی نمبر ہے گویا یہ ایک 'متحاس' ہے جس سے یہ معلوم کرنا مقصود ہے کہ اتنے خریدار فراہم ہوتے ہیں یا نہیں جو اسے کفیل بالذات بنا دیں۔ اگر ایسا ہوا تو فیہا ورنہ احتمال اس کا ہے کہ ایک "Longing tearful adieu" 'پر حسرت اور اشک فشان الوداع' کے ساتھ وہ ہم سے رخصت ہو جائے گا۔ تاہم یہ اخباری برادری کے لیے ایک نیا پیمانہ چھوڑ جائے گا جس کے ذریعے وہ اپنی مختصر سی تہیلی کا جائزہ لے سکے گی۔

اگر اخبار کا معیار آئندہ بھی وہی رہے گا جو اس نمبر کا ہے تو ہم ابھی سے مایوس ہو چکے۔ اداریہ کی انگریزی میں یو پ اور ڈرائیون کا اسلوب اختیار کیا گیا ہے۔ یہ برا نہیں ہے کہ جہاں اردو میں اب بھی طلسم ہوش رہا اور فسانہ عجائب کی پیروی کرنے والے حضرات موجود ہیں کیوں نہ انگریزی کا وہ دور زندہ کیا جائے جب ایک ایک جملے میں سوسو بل اور ہر ہر بل میں ہزاروں پوچھ ہوتے تھے۔

انگریزی کے چار صفحات میں سے تیسرے صفحہ ان شقوں کے لیے وقف ہے جو بعض حکام نے ایڈیٹر صاحب کے خطوط کے جواب میں ارسال کی تھیں۔ یہ علی گڑھ کی سنت دیرینہ ہے جس کے متعلق کچھ کہنا سوئے ادب سمجھا جائے گا۔

شعبہ اردو ایک قصیدہ سے شروع ہوتا ہے جو نواب صاحب بھوپال کی تعریف میں ہے۔ پھر کچھ خطوط اور 'کھلمدرے پن' کی باتیں ہیں۔ ایک در رخی تصویر ہے جس میں سے ایک طرف کچھ کمنام علیگ صاحبان کا گروپ ہے اور دوسری طرف ایک کارٹون ہے۔

اگر واقعاً یہ جریدہ علمی گزہ کی اصلاح کے لیے نکالا گیا ہے تو اس کا پیرایہ زیادہ متین اور سنجیدہ ہونا چاہیے۔ اسے ان بنیادی مسائل کو پیش کرنا چاہیے جن پر علمی گزہ کی موجودہ مہمات اور آئندہ حیات کا دار و مدار ہے۔

(نا خدا)

## ہمایوں کا روسی ادب نمبر

مئی سنہ ۳۵ ع۔ مرتبہ بشیر احمد صاحب بی۔ اے (آکسن)

حجم - معمولی نمبروں سے کچھ زیادہ۔

روسی ادب سے ہمدوستانی تعلیم یافتہ طبقے کی روز افزوں دلچسپی اس ذہنیت کا پرتو ہے جو نظام زندگی کے انتشار کی وجہ سے پیدا ہو گئی ہے۔ بے کاری اور افلاس کی گراں باری ادب کو رومانی فضا سے نکال کر حقیقت نگاری کی طرف آنے کے لیے مجبور کر رہی ہے۔

اس لیے جب ہم نے سنا کہ پنجاب کا ممتاز ماہ نامہ 'ہمایوں' ایک روسی ادب نمبر نکال رہا ہے تو ہمیں خوشی ہوئی اور ہم اس کی اشاعت کے ملتظر رہے۔ لیکن یہ دیکھ کر مایوسی ہوئی کہ ادارہ نے اس کی ترتیب میں کاروش سے کام نہیں لیا۔ ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں

کہ پورے روسی ادب کا احاطہ ایک آدھ سو صفحات کے رسالے میں کیسے کیا جا سکتا ہے۔ طالسٹائی، دستوویسکی، گورکی یا کسی بھی قابل ذکر ادیب کے تعارف کے لیے اتنا بڑا نمبر مشکل سے کافی ہوتا۔ چاہیے یہ تھا کہ روسی ادب کے ہر دور کا ایک مختصر سا تجزیہ پیش کیا جاتا اور ہمیں یقین تھا کہ پیش نظر سالہ میں کم از کم دور قدیم اور دور جدید پر اجمالی نظر ڈالی گئی ہوگی۔ لیکن یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ روسی ادب پر کوئی تنقیدی مضمون نہیں ہے اور جو ایک 'طائرانہ نگاہ' ہے بھی تو اس کی حیثیت ادیبوں کی پیدائش اور موت کی تاریخوں کے گوشوارہ سے زیادہ نہیں! پھر یہ سمجھہ میں نہ آیا کہ اس ادبی نمبر میں 'بولشویک روس کا پس منظر'، 'لینن خدا کے حضور میں' اور 'روسی تاریخ کے مشہور سنیں' کی اشاعت کا کیا موقع و محل تھا، بنا بریں، بولشویک روس کا پس منظر جس مطالعے اور تحقیق کا محتاج ہوگا اس مضمون کے احاطے سے باہر ہے۔

یہ بھی سمجھہ میں نہ آیا کہ یہ نمبر پورے روسی ادب کے لیے وقف ہے یا جدید روسی ادب کے لیے۔ اگر کلاسک ادب کی مثالیں دینا منظور تھیں تو دستوویسکی یا پیشکن کو کیوں کر نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ اور اگر طرز جدید کو نمایاں کرنا تھا تو گواکی، روپیناف، بیبل یا ایرن برگ کو کیسے فراموش کیا جا سکتا ہے مثالوں کے انتخاب میں بھی خوش ذوقی سے کام نہیں لیا گیا۔

مختصر یہ کہ اس نمبر کی ترتیب جلدی میں کی گئی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ کل ترجمے قلم برداشتہ ہرے ہیں اور وہ بھی ایک ہی قلم سے۔ اس قلم کی گل فشانی ملاحظہ ہو:

”جنگ کی ستم آفرینہوں کی یاد“

اور اس کے ہر ایک صید بسمل کا تصور‘

واپستہ کر دیتا ہے مہرا رشتہ ہمدردی‘

مرتے ہوئے نوجوان دوست اور بیماری بیوی سے زیادہ اہم ہستی کے ساتھ۔

ایک تو ترجمہ در ترجمہ اور پھر یہ الجھی ہوئی تکریر — ستم

بالاے ستم ہے —

رسالے کے آخر میں ایک دلچسپ فرورگزاشت ملے گی۔ ایک نظم اور

ایک اشتہار ساتھ ساتھ چھپے ہیں — جن میں سے نظم کا عنوان ہے

’عشق انوکھی ریت ہے پیارے‘ جواب برآمد ’صرف پایہوں کے لیے‘!

مضامین اور اشتہارات ایک صفحے پر نہ چھاپے جائیں تو اچھا ہو —

امید ہے کہ ادارہ ہمایوں اپنے آئندہ فرانسیسی ادب نمبر میں

ایسی خامیوں کا اعادہ نہ ہونے دے گا —

’ناخدا‘



## سائنس

# انجمن ترقی اردو کا سالانہ رسالہ

جس کا مقصد یہ ہے کہ سائنس کے مسائل اور خیالات کو اردو دانوں میں مقبول کیا جائے، دنیا میں سائنس کے متعلق جو نئی بحثیں یا ایجادیں اور اختراعیں ہو رہی ہیں یا جو جدید انکشافات و ترقیاً فوقتاً ہونگے، ان کو کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان کیا جائے۔ ان تمام مسائل کو حتی الامکان صاف اور سلیس زبان میں بیان کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس سے اردو زبان کی ترقی اور اہل وطن کے خیالات میں روشنی اور وسعت پیدا کرنا مقصود ہے۔

رسالے میں متعدد بلاک بھی شائع ہوتے ہیں۔

سالانہ چندہ سات روپے سکے انگریزی (آٹھ روپے سکے عثمانیہ) نمونہ کی قیمت ایک روپیہ بارہ آنے سکے انگریزی (یا دو روپے سکے عثمانیہ) -- طلباء کے ساتھ یہ رعایت کی جاتی ہے کہ یہ رسالہ بہ تصدیق پروفیسر صاحب (یا ہیڈ ماسٹر صاحب) انہیں پانچ روپے چار آنے سکے انگریزی (چھ روپے سکے عثمانیہ) سالانہ چندہ میں دیا جاتا ہے۔

امید ہے کہ اردو زبان کے بہی خواہ اور علم کے شائق اس کی سرپرستی

فرمائیں گے۔

انجمن ترقی اردو اورنگ آباد (دکن)

VOL. 15

JULY 1935

No. 59

# The Ardu

## The Quarterly Journal

OF

## The Anjuman-i-Taraqqi-e-Urdu

EDITED BY

**Abdul Haq, B.A., (Alig.)**

HONORARY SECRETARY

Anjuman - i - Taraqqi - e - Urdu, Aurangabad, (Deccan).













